Registered No. L. 4186

شعبان ۱۳۶۱ھ

جلد ۲۱ — عدد ۲

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ ۴ر

قیمت فی پرچہ ہر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق اج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بجلد دو روپے قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۸/- مجلد ۲/-/- محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

بابت شعبان سنہ ۶۱ھ (ستمبر ۴۲ء) جلد ۲۱ - عدد ۱

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس
سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر "ترجمان القرآن" - لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کی اشاعت میں ایک مدت سے جو بے قاعدگی چلی آرہی ہے اس کی وجہ سے ناظرین کو سخت شکایت ہے میں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح رسالہ کی اشاعت اپنے وقت پر ہونے لگے، اور اسی غرض کے لیے متعدد مرتبہ کئی کئی مہینوں کے پرچے ملا کر یکجا شائع کیے مگر اس کے باوجود اشاعت کا نظام درست کرنے میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اب اس خرابی کا کوئی علاج اس کے سوا نظر نہیں آتا کہ جمادی الاولیٰ جمادی الآخرہ اور رجب کی اشاعت منسوخ کرکے شعبان کا پرچہ شعبان ہی میں شائع کردیا جائے اور منسوخ شدہ مہینوں کے عوض تمام خریداروں کی مدت اشاعت میں ۳ مہینہ کا اضافہ کردیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق اب یہ شعبان کا پرچہ شائع ہو رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آئندہ کے لیے رسالہ کی اشاعت کا نظام درست رہے۔

پریس اور کاغذ کے لیے ہم نے اپنے ہمدردوں سے اعانت کی درخواست کی تھی اس کے جواب میں ۵ ستمبر تک جو رقمیں وصول ہوئی ہیں ان کی مجموعی مقدار دو ہزار سات سو چھبیس روپے ہے۔ اس میں سے ۱۶۲۰ روپے بطور اعانت آئے ہیں اور ۱۱۰۰ روپے بطور قرض۔ پریس خرید لیا گیا ہے اور یہاں لا کر نصب کیا جا چکا ہے۔ اب صرف بجلی کی آمد اور ڈیکلریشن کی منظوری کا انتظار ہے۔ یہ دو مرحلے طے ہونے کے بعد ان شاء اللہ ہماری مطبوعات خود اپنے پریس میں طبع ہونے لگیں گی۔ اب دوسری اہم ضرورت کاغذ کے ذخیرہ کی فراہمی ہے جس کے لیے ہم پوری جدوجہد کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ابھی ہم کو مزید اعانت کی ضرورت ہے۔

ربیع الآخر کی اشاعت میں جس بنگلہ کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا اس کے لیے ابھی ابتدائی انتظامات بھی پوری

طرح نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہم نے ابھی صرف تجویز کا اظہار کیا ہے، قیام کا اعلان نہیں کیا ہے۔ لہٰذا کوئی صاحب اس غلط فہمی کی بنا پر اپنے بچے یہاں نہ بھیج دیں کہ باقاعدہ کام شروع ہو چکا ہے جن حضرات کا ارادہ اپنے بچے یہاں بھیجنے کا ہو وہ سر دست ہم کو صرف اپنے ارادے سے آگاہ کر دیں اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیں کہ بچے کی عمر کیا ہے، اس کی اب تک کی تعلیم کس نوعیت کی اور کس حد تک ہوئی ہے، اور وہ اس کے تعلیمی خرچ کا کس قدر بار اٹھا سکتے ہیں تب ہم اپنے انتظامات مکمل کر لیں گے تو ان کو اطلاع دیدیں گے۔

نئے مرکز کی تاسیس اور جماعت کے آئندہ کام کے سلسلہ میں اس وقت چند ایسے اہم مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے جماعت کی مجلس شوریٰ کا انعقاد ناگزیر ہو گیا ہے۔ اگرچہ ان مسائل کی نوعیت تو اس کی متقاضی تھی کہ اجتماع عام کی دعوت دی جائے لیکن ملک کے موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے، لہٰذا مجبوراً یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ شوال کے دوسرے ہفتہ میں صرف اصحاب شوریٰ کو مجتمع کر کے ان امور کا تصفیہ کر لیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اس مشورہ میں ہم کو ایسے فیصلے کرنے پڑیں جن کا جماعت کے نظام اور اس تحریک کے مستقبل پر غیر معمولی اثر مترتب ہو، لہٰذا میں رفقائے جماعت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اصحاب شوریٰ کے خلوص اور ان کی اصابتِ رائے پر پوری طرح اعتماد کریں اور اطمینان رکھیں کہ اس مقصد عظیم کی خدمت کے لیے بہتر سے بہتر ممکن صورت اختیار کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ شوریٰ کے لیے ۹ شوال مقرر کی گئی ہے اور ارکان شوریٰ کی سہولت کے لیے مقام اجتماع دہلی تجویز ہوا ہے۔

"تفہیم القرآن" میں آیت وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (رکوع ۲۴) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ "باز آجانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آجانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آجانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھنا چاہتا ہے رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اسے فہمائش اور نصیحت کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں لیکن اسے یہ حق ہرگز

نہیں ہو کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ بنائے یہ فتنہ بزور شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی اس روش سے باز نہ آجائیں"۔ اس تفسیر کے خط کشیدہ فقرے پر ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب علم بزرگ نے حسب ذیل اعتراض کیا ہے

"(ا) اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام جو امن اور سلامتی کا حامی اور مؤید ہے، دوسروں کے مذہب میں مداخلت اور اس بنا پر لڑائی روا رکھتا ہے حالانکہ یہ امر لا اکراہ فی الدین کے مخالف ہے۔

(ب) مخالفین کو اپنے اپنے مذہب اور عقائد پر قائم رہنے کی آزادی لکم دینکم ولی دین سے بھی ظاہر ہے۔ جو کوئی اپنے عقائد میں آزاد ہوگا اسے ان کی اشاعت اور تبلیغ میں بھی آزادی ہونی چاہیے کیونکہ وہ انہی عقائد کو برحق سمجھتا ہے۔ قرآنی مفہوم سے اسی آزادی کا پتہ چلتا ہے اور باہمی مناظرات کا ثبوت بھی ملتا ہے، مثلاً وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ غیر مذاہب کے عبادت خانے اور طریق عبادت اسلامی مداخلت سے محفوظ رہے ہیں حتیٰ کہ مسجد نبوی میں اہل کتاب کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی گئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی ملازمت اختیار کی جس کا عقیدہ اور عمل مشرکانہ تھا ہاں اپنے طور پر امن کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے جیسا کہ يَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ سے ظاہر ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی اپنے خیالات و عقائد کی اشاعت کا حق پہنچتا ہے۔

(ج) زیر خط عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان کہیں بھی مخلوط آبادی میں امن سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ غیر مسلم تمدنی اور معاشرتی امور میں بھی کیوں ان کے ساتھ تعاون باہمی اور رواداری سے کام لیں جب کہ ان کا سیاسی اور اساسی عقیدہ ہی سد راہ ہو؟ ایسے مسلمان اگر ترکی اور ایران میں بھی آباد ہوں تو بقول آپ کے وہاں بھی انہیں علم جہاد بلند کرنا ہوگا کیونکہ ان ممالک میں حدود اور قوانین اسلامی نافذ نہیں۔ اس زمانہ میں عالمگیر سیاست اس نہج پر مدون ہے کہ کوئی جماعت غیر معروف طریقوں

سے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل باہمی سے کام نہیں لے سکتی کیونکہ آپ کا فرمودہ استدلال کسی اشتراکِ عمل کے لیے مانع ہوگا۔ اگر اسلامی جماعت اپنے عقائد کی اشاعت کا حق رکھتی ہے تو اسے غیر مسلموں کو بھی، خصوصاً جب کہ وہ حکمراں ہوں وہی حق دینا ہوگا۔ ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔ رسولِ اکرم صلعم نے مدینہ منورہ کے اہلِ کتاب کے ساتھ جو تعاملِ باہمی کے معاہدے کیے تھے کیا وہ معاہدے ایسی شرائط پر مبنی تھے؟ مکی زندگی کے ابتدائی مراحل آپ کے استدلال کے مؤید نہیں۔ بالفاظِ دیگر ایسی جماعت کا وجود ہی کسی غیر مسلم حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہے کہ جونہی اسے قوت ملی وہ اس کے قوانین اور اس کے نظامِ حکومت کو مٹانے کے لیے تلوار ہاتھ میں لے لے گی۔ کون اس کو برداشت کرلے گا؟"

اس اعتراض کا مختصر جواب خط کے ذریعہ سے دیا جاسکتا تھا، لیکن یہ اعتراض جس طرزِ خیال کی ترجمانی کر رہا ہے وہ آج کل عام طور پر پھیلا ہوا ہے، اور قریب قریب ہر جگہ وہی دلائل اس طرزِ خیال کی تائید میں ہرائے جاتے ہیں جو صاحبِ معترض نے تحریر فرمائے ہیں، اس لیے یہاں اسے نقل کرکے جواب دیا جارہا ہے۔

یہ بحث تو بعد میں ہوتی رہے گی کہ اسلام امن اور سلامتی کا مؤید کس معنی میں ہے اور لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین کا کیا مطلب ہے، اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبوت کرنے آئے تھے یا تلاشِ روزگار میں نکلے تھے۔ ان سب باتوں سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا چاہیے کہ فی الواقع اسلام کا مشن اس دنیا میں ہے کیا۔ کیا وہ جباروں کی سواری کے لیے انسانوں کو سدھانے آیا ہے؟ کہ ہر جبار جب دنیا میں خدائی کرنے اٹھے تو اسلام کے پیرووں کو اپنا اطاعت گزار خادم پائے؟ کیا اس نے دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے لیے پُرامن رعیت فراہم کرنے کا اجارہ لیا ہے کہ ہر حکومت کو اپنی مشینری چلانے کے لیے اسلام کے کارخانہ سے ہر قسم کے ڈھلے ڈھلائے پرزے حاصل ہوجایا کریں، قطع نظر اس سے کہ حکومت کا نظام کچھ ہو؟ کیا اس کا کام بس یہی ہے کہ چند عقائد اور چند اصولِ اخلاق کی تعلیم دے کر آدمیوں میں اتنی لچک اور اتنی نرمی پیدا کردے کہ وہ ہر نظامِ تمدن میں بآسانی کھپ سکیں بلالحاظ اس کے کہ اس نظام کی نوعیت کیسی ہی ہو؟

اگر معاملہ حقیقت میں یہی ہے تو اسلام بودھ مذہب اور سینٹ پال کی بنائی ہوئی مسیحیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف چیز نہیں ہے اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے مذہب کی کتاب میں قاتلوھم جیسا خوفناک لفظ سرے سے آیا ہی کیوں۔ اسے تو اپنے پیروؤں کو جنگ و جہاد کا حکم دینے کے بجائے اپنے مخالفین سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ہم غریبوں کو آخر کیوں مارتے ہو؟ ہم نہ نظام حکومت میں کوئی انقلاب کرنا چاہیں نہ نظام تمدن میں کسی ترمیم و تنسیخ کی دعوت دیں، اقتدار کسی کا ہو اس کے ماتحت پُرامن باشندوں کی حیثیت سے رہنا ہمارا مسلک اور حکومتِ وقت کی وفاداری ہمارا دین و ایمان، پھر ہم سے تمھیں پرخاش کی کیا وجہ؟ رہا ہمارا مذہبی عقیدہ اور ہمارا پوجا پاٹ کا نظام تو اس سے تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ تمھارا کونسا تمدنی ادارہ اور کونسا مفاد ایسا ہے جس پر ہمارے عقیدے یا ہماری پوجا کی ضرب پڑتی ہو۔ یہ جواب اگر اچھے معقول پیرایہ میں دیا جاتا اور عملاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو وفادارانہ خدمات بھی انجام دیتے رہتے تو مشرکینِ مکہ ہمارے انگریز آقاؤں کے مقابلہ میں کچھ ایسے زیادہ نامعقول نہ تھے کہ مسجدوں میں اذان و نماز کی آزادی اور تبلیغی انجمنوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔

لیکن اگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اسلام خود اپنا ایک نظامِ زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد، اخلاق اور عبادات کے ساتھ انفرادی طرزِ عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں، اور اسلام کی دعوت اپنے اس پورے نظام کی طرف ہے، اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہی نظام حق ہے اور اسی میں انسان کی فلاح ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام باطل ہے، تو اس کے ساتھ یہ قطعی ناگزیر ہے کہ وہ زمین میں اپنے نظام کے قیام اور دوسرے نظامات کے مٹانے کا بھی متقاضی ہو، کیونکہ اول تو ایک نظامِ زندگی کو حق اور صدق ہونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور پھر عملاً اس کی اقامت کی دعوت نہ دینا سراسر ایک مہمل بات ہے اور اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ دوسرے نظامات کو باطل بھی کہا جائے اور ان کے وجود کو برداشت بھی کیا جائے۔ دوسرے یہ بات بداہۃً محال ہے کہ ایک نظامِ زندگی کی

پیروی کسی دوسرے نظامِ زندگی کے ماتحت رہتے ہوئے کی جاسکے اس لیے وہ صرف ایک فاترالعقل ہی ہو سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے پیش کردہ نظام کی پیروی کا مطالبہ بھی کرے اور ساتھ ہی دوسرے نظامات کے اندر پُرامن وفادارانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دے۔ پس اسلام کا ایک نظامِ زندگی کی طرف دعوت دینا عین اپنی فطرت میں اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظامات کو مٹا کر ان کی جگہ اپنے نظام کی اقامت کا مطالبہ کرے، اور اس مقصد کے لیے اپنے پیروؤں کو جدوجہد کی ان تمام صورتوں کے اختیار کرنے کا حکم دے جن سے یہ مقصد حاصل ہوا کرتا ہے، اور مدعیانِ اتباع کے ایمان وعدمِ ایمان کا نشانِ امتیاز اسی کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان ومال کی بازی لگاتے ہیں یا باطل نظامات کے ماتحت بیٹھے پر راضی رہتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو صاف نظر آجائے گا ــــ بشرطیکہ دل میں کوئی چور نہ ہو ــــ کہ اسلام نے یہی دوسری پوزیشن اختیار کی ہے نہ کہ پہلی۔

جب حقیقت یہ ہے اور ہم اسلام کی اس حقیقت کو جان کر اس پر ایمان لائے ہیں تو یقیناً ہمارے وجود کو ہر غیر اسلامی حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہونا چاہیے۔ کوئی اس کو برداشت کرے یا نہ کرے، غیرمسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل ہو سکے یا نہ ہو سکے، بہرحال اگر ہم اپنے ایمان میں صادق ہیں تو ہمارا کام یہی ہے کہ جہاں بھی خدا کا قانونِ شرعی نافذ نہیں ہے وہاں اس کے نفاذ کے لیے علمِ جہاد بلند کریں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں وہ اسے برداشت بھی کریں، اور نہ غیرمسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل ہمارے لیے اس قدر قیمتی ہے کہ جس نظامِ زندگی پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے قیام کی جدوجہد صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ غیرمسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل اس صورت میں نہ ہو سکے گا۔ اسلام بے شک امن اور سلامتی کا حامی اور مؤید ہے، مگر اس کی نگاہ میں امن اور سلامتی

وہی ہے جو حدود اللہ کی اقامت سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظامات کے زیرِ سایہ اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار چلتے رہیں اور مسلمان کی نکسیر تک نہ پھوٹے، اس نے اسلام کا نقطۂ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ اسلام ایسے امن اور ایسی سلامتی کا ہرگز حامی اور مؤید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔

رہا لا اکراہ فی الدین، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد زبردستی کسی سے نہیں منواتا کیونکہ یہ منوانے کی چیز نہیں ہے، اسی طرح وہ اپنی عبادات بھی، جن کا لازمی تعلق اس کے عقائد سے ہے، زبردستی کسی پر مسلط نہیں کرتا، کیونکہ ایمانِ صحیح کے بغیر وہ بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں امور میں وہ ہر ایک کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ قوانینِ تمدن جن پر اسٹیٹ کا نظام قائم ہوتا ہے، خدا کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے ہوں اور خدا کے باغی اُن کو نافذ کریں۔ اس معاملہ میں بہرحال ایک فریق کو دوسرے فریق کے مذہب میں مداخلت کرنی ہی پڑے گی تو بجائے اس کے کہ کافر اہلِ ایمان کے مذہب میں مداخلت کریں، زیادہ بہتر یہ ہے کہ اہلِ ایمان اُن کے مذہب میں مداخلت کریں۔ نہ کریں گے تو خدائی مذہب کا ایک بڑا حصہ معطل ہو جائے گا اور اہلِ ایمان کی زندگی کے ایک بڑے حصہ پر کفار کا مذہب مسلط ہوگا۔

تفہیم القرآن

(۵)

البقرہ

(از رکوع ۳۴ تا ختم سورہ)

اللہ، وہ زندہ خدا جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں[1]، نہ اسے اونگھ لگتی ہے نہ نیند آتی ہے[2]، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے[3]، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے[4]، جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے

---

[1] یہ اور بات ہو کہ نادان لوگوں نے بے شمار دوسرے الٰہ بنا رکھے ہوں، مگر حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اللہ ہی اکیلا اس کائنات کا سلطانِ مطلق ہے جس کے بل بوتے پر پورا نظام عالم چل رہا ہے۔ لہٰذا فی الواقع صرف وہی ایک الٰہ ہے۔ باقی سارے مزعوم الٰہوں کی الٰہیت جھوٹی اور غیر واقعی ہے۔ اُس کے سوا کوئی دعائیں سننے اور حاجتیں پوری کرنے کا اقتدار نہیں رکھتا، کسی کے پاس قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات نہیں، کسی دوسرے کو اس کی سلطنت میں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جھکایا جائے، کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ اس کا حکم قانون ہو اور بے چون و چرا تسلیم کیا جائے، کوئی عیوب و نقائص سے پاک نہیں کہ اسے مقدس و منزہ مانا جائے۔ یہ تمام خصوصیات جو الٰہیت کے لوازم میں سے ہیں تنہا اللہ ہی کے لیے مخصوص ہیں، کسی دوسرے کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔

[2] یہ ان لوگوں کے خیالات کی تردید ہے جو خداوند عالم کی ہستی کو اپنی ناقص ہستیوں پر قیاس کرتے ہیں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

[3] اس فقرے میں اُن مشرکین کے باطل اوہام کا رد کیا گیا ہے جو اپنے اپنے گمانوں کے مطابق خدائی میں دوسری ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ زمین و آسمان کا مالک اور ہر اس چیز کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ اس کی ملکیت میں، اس کی تدبیر میں، اس کی بادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، بلکہ جس دوسری ہستی کا بھی تم تصور کر سکتے ہو وہ بہر حال اس سلطنتِ کائنات کی ایک رعیت ہی ہوگی، پس جو خود مملوک ہو وہ مالک کے ساتھ حقوقِ ملکیت میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔

[4] یہ اُن مشرکین کے خیالات کا ابطال ہے جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری ہستیوں کے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اور جہل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔[۱] اس کی حکومت[۲] آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے جن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں، وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔[۳]

(بقیہ صفحہ سابق) متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر اَڑ بیٹھیں وہ کرا کے چھوڑتے ہیں اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اُس پادشاہ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ اوپر کے فقروں میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود حاکمیت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کوئی اس کے ہاں ایسا زور آور ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جن یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظام عالم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوند عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں۔

[۲] اصل میں لفظ کرسی استعمال ہوا ہے جسے بالعموم حکومت و اقتدار کے لیے استعارہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

[۳] یہ آیت "آیت الکرسی" کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس محل پر خداوند عالم کی ذات و صفات کا یہ ذکر کس مناسبت سے آیا ہے، تو اسے سمجھنے کے لیے اُس تقریر کی ترتیب پیش نظر رہنی چاہیے جو رکوع ۳۲ سے چل رہی ہے۔ پہلے مسلمانوں کو دین حق کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جدوجہد کرنے پر اکسایا گیا ہے اور اُن کمزوریوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ فتح و کامیابی کا مدار تعداد اور ساز و سامان کی کثرت پر نہیں بلکہ ایمان، صبر و ضبط اور پختگی عزم پر ہے۔ پھر جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت وابستہ ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ دنیا کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے وہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا ہے ورنہ ایک ہی گروہ کو اگر غلبہ و اقتدار کا دائمی پٹہ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے[۱] صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے اب جو کوئی طاغوت[۲] کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) مل جاتا تو دوسروں کے لیے جینا دشوار ہو جاتا۔ پھر اُس شبہ کو دفع کیا گیا ہے جو ناواقف لوگوں کے دلوں میں اکثر کھٹکتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر اختلافات کو مٹانے اور نزاعات کا سدباب کرنے ہی کے لیے بھیجے تھے اور ان کی آمد کے باوجود نہ اختلافات مٹے، نہ نزاعات ختم ہوئے، تو کیا اللہ ایسا ہی بے بس تھا کہ اس نے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہا اور نہ کرسکا؟ اس کے جواب میں بتادیا گیا کہ اختلافات کو بجبر رد کردینا اور نوعِ انسانی کو ایک خاص راستہ پر بزور چلانا اللہ کی مشیت ہی میں نہ تھا؛ ورنہ انسان کی کیا مجال تھی کہ اس کی مشیت کے خلاف چلتا۔ پھر ایک فقرے میں اُس اصل مضمون کی طرف اشارہ کردیا گیا جس سے تقریر کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور مسالک و مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، بہرحال حقیقتِ نفس الامری یہ ہے جس پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔ انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ماننے پر لوگوں کو زبردستی مجبور کیا جائے۔ جو اسے مان لے گا وہ خود ہی فائدہ میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا وہ آپ نقصان اٹھائے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں "دین" سے مراد اللہ کے متعلق اُس عقیدہ کو تسلیم کرنا ہے جو آیت الکرسی میں بیان کیا گیا ہے۔

[۲] "طاغوت" لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کرکے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلہ میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرماں برداری کا معترف ہو مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے، اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہو کر خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے، یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبہ پر جو بندہ پہنچ جائے اسی کا نام طاغوت ہے۔ لہٰذا کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ طاغوت کا منکر نہ ہو۔

ہے۔ اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں[2] اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں[1]
کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع
تم نے[3] اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا؟[4] جھگڑا اس بات پر

[1] تاریکیوں سے مراد جہالت کی تاریکیاں ہیں جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح و سعادت کی راہ سے دور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مراد علمِ حق ہے جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت ایک صحیح راہِ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

[2] طاغوت کو بصیغۂ جمع استعمال کیا ہے، اس لیے کہ خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے جو اس کے سامنے ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے، دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے جو اسے جذبات و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے پھرتا ہے، اور بےشمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں بیوی اور بچے، اعزا و اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے، اور بےشمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

[3] اوپر دعویٰ کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور وہ اسے تاریکیوں سے روشنی میں لاتا ہے اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور وہ اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب اسی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہو گیا، مگر چونکہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی اس لیے وضوحِ حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں جنھوں نے اللہ کا سہارا پکڑا تھا سو اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مشاہدہ کرا دیا۔

[4] اس شخص سے مراد نمرود ہے جو حضرت ابراہیم کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جب حضرت ابراہیم نے اپنے وطن میں توحید کا اعلان کیا اور ان تمام الٰہوں اور ارباب کی بندگی سے انکار کر دیا جن کی بندگی ان کے اہلِ وطن کر رہے تھے تو رفتہ رفتہ خاندان، برادری، اور قوم سے گذر کر حکومتِ وقت سے ان کے تصادم کی نوبت آئی اور انھیں ایک باغی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

کہ ابراہیم کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اُس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی[۵۱] جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیم نے کہا، اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا،[۵۲] مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا[۵۳] جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری

---

۵۱ ان الفاظ سے جھگڑے کی نوعیت پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ نمرود کو خدا نے جو حکومت دے رکھی تھی اس کے نشہ میں مدہوش ہو کر وہ اس حقیقت کو بھول چکا تھا کہ ملک خدا کا ہے اور اس کی اصل حیثیت مالک کے نائب کی ہے جس کا کام مالک کے احکام کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔ نائب کے بجائے وہ خود مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ (یعنی رب) ہونے کا مدعی تھا۔ برعکس اس کے حضرت ابراہیم جس طرح دیوتاؤں کی الٰہیت کے منکر تھے اسی طرح شاہی خاندان کی ربوبیت کا بھی انکار کرتے تھے اور ان کی دعوت یہ تھی کہ تمام حیثیات سے تنہا اللہ ہی الٰہ اور رب ہے۔

یہاں یہ بات اور اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نمرود نہ تو اللہ کے وجود اور اس کے خالقِ زمین و آسمان اور مدبرِ کائنات ہونے کا منکر تھا اور نہ خود کائنات کا رب ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا جیسا کہ بعض مفسرین نے غلطی سے سمجھا ہے، بلکہ اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں اپنے ملک اور اس کے باشندوں کا رب یعنی حاکمِ مطلق ہوں، میری زبان قانون ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں۔

۵۲ اگرچہ حضرت ابراہیم کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تاہم نمرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اُسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں جس کو ابراہیم نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا۔ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا لہٰذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا تو اس کے لیے حضرت ابراہیم کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کھل جاتی۔

۵۳ یہ ایک فضول بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدعا جس کے لیے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

پڑی تھی۔ اُس نے کہا یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟[1] اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا "تم پر سو برس اسی حالت میں گذر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے، دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں[2]۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں"۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے جب ابراہیم نے کہا تھا کہ "میرے مالک مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے"۔ فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے[3]۔ فرمایا، اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے، پھر ان کا ایک ایک جزء ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے، خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار

(بقیہ صفحہ سابق) یہاں ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام، دونوں کے تعین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اس سوال سے یہ مدعا نہیں کہ سائل حیات بعد الموت کے منکر تھے، یا انھیں اس میں شک تھا، بلکہ در اصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے۔

[2] ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مردہ سمجھ چکی تھی، یہ بجائے خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

[3] یعنی وہ اطمینان جو مشاہدۂ عینی سے حاصل ہوتا ہے۔

اور حکیم ہے[1]۔ ۳۵ع

[2]جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں[3] اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

[1] اِس واقعہ اور اوپر کے واقعہ کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے اُسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ عام اہلِ ایمان کو اس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے اس کے لیے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے۔ لیکن انبیاء کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دنیا کو دینی تھی۔ ان کو دنیا سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم قیاسات دوڑاتے ہو مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں، تمھارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو اور ہم بینا ہیں۔ اسی لیے انبیاء کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں، ان کو آسمان و زمین کے نظامِ حکومت (ملکوت) کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو دوزخ اور جنت آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصبِ نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گذر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادۃ کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت انھی کے ساتھ مخصوص ہے۔

[2] اب پھر سلسلۂ کلام اُسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے جو رکوع ۳۲ میں چھیڑا گیا تھا۔ اس تقریر کی ابتدا میں اہل ایمان کو دعوت دی گئی تھی کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لائے ہو اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر یہ بات کہ ایک گروہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض کے لیے نہیں بلکہ محض ایک بلند اخلاقی مقصد کے لیے مال و دولت لٹائے، اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا معاشی نقطۂ نظر بالکل تبدیل نہ ہو جائے۔ مادّہ پرست لوگ جو پیسہ کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پر جان دیتے ہوں اور نفع و نقصان کی میزان ہی پر جن کی نگاہ ہر وقت جمی رہتی ہو، وہ کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصدِ عالیہ کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ بظاہر اخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادّی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اِس ذہنیت کے ساتھ اُس دین کی راہ میں انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دوسری ہی قسم کے اخلاقیات درکار ہیں۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلہ کی فراخی، دل کی کشادگی اور سب سے بڑھ کر خالص خدا طلبی کی ضرورت ہے، اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نشوونما پائیں۔ چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رکوعوں تک اسی ذہنیت کی تخلیق (باقی اگلے صفحہ پر)

دانہ بویا جائے تو اُس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ ۱۰ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرکے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ۱۱ ایک میٹھا بول، اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس صدقے ۱۲ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو، اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ ۱۳ اے ایمان لانے والو!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

۹ مال کا خرچ خواہ اپنے اعزہ واقربا کی خبر گیری میں ہو یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہ عام کے کاموں میں، یا اشاعت دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہر حال اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے ہے تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۰ یعنی جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبہ کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ جو خدا ایک دانہ میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمہاری خیرات کو بھی اسی طرح نشو و نما بخشے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گونہ ہو کر تمہاری طرف پلٹے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فراخ دست ہے، اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمہارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو وہ نہ دے سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبہ سے کرتے ہو، اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمہارا اجر مارا جائے۔

۱۱ یعنی نہ تو ان کے لیے اس بات کا خوف ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

۱۲ صدقہ کا لفظ صدق سے نکلا ہے جس کے اصل معنی سچائی کے ہیں، اور اس سے مراد وہ خیرات ہے جو خدا پرستی کے سچے جذبے کے ساتھ کی جائے۔ اصطلاحاً صدقہ اور زکوٰۃ میں یہ فرق ہے کہ جو خیرات شرعاً لازم کی گئی ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور جو خیرات رضا کارانہ اپنی خوشی سے کی جائے اس کو صدقہ کہتے ہیں۔ لیکن قرآن بالعموم اس اصطلاحی فرق کو نظر انداز کرکے صدقہ اور زکوٰۃ دونوں کو ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

۱۳ اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تمہاری خیرات کا حاجتمند نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالےٰ چونکہ خود بردبار ہے اس لیے اسے پسند بھی وہی لوگ ہیں جن کے اندر بردباری کی صفت ہو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔[۱] اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی، اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔[۲] ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔[۳] بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے

(بقیہ صفحہ سابق) جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمہارے قصوروں کے باوجود تمہیں بار بار بخشتا ہے وہ ایسے لوگوں کو کیوں کر پسند کر سکتا ہے جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں تو احسان جتا جتا کر اس کی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہمکلامی اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا جو اپنے عطیہ پر احسان جتاتا ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اُس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔

[۲] اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے، اور چٹان سے مراد اُس نیت اور اُس جذبہ کی خرابی ہے جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے اور مٹی کی ہلکی تہہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضاء تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور کھیتی نشوونما پائے لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اوپر ہی اوپر ہو اور اس اوپری تہہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو تو بارش مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشوونما دینے کی قوت رکھتی ہے مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابرِ کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے اور کچھ نہیں۔

[۳] یہاں "کافر" کا لفظ ناشکرے اور منکرِ نعمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو (باقی صفحہ آئندہ پر)

کافی ہو جائے[۲۰]۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اُس وقت ایک تیز گرم بگولے کی زد میں آ کر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں[۲۱]؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے شاید کہ تم غور و فکر کرو۔ ع

اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اُس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کرو گے الا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمہیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے[۲۲]۔

(بقیہ صفحہ سابق) اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے تو اس کے ساتھ اذیت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے۔ اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۲۰] "زور کی بارش" سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبۂ خیر اور کمال درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے۔ اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے جس کے اندر جذبۂ خیر کی شدت نہ ہو۔

[۲۱] یعنی اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے جبکہ تم اُس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور از سرِ نو کمائی کرنے کا موقع بھی باقی نہ ہو، تو کیا تم یہ پسند کرو گے کہ دنیا میں مدۃ العمر کام کرنے کے بعد جب آخرت کی زندگی میں تم قدم رکھو تو وہاں یکایک تمہیں معلوم ہو کہ تمہارا پورا کارنامۂ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا، جو کچھ تم نے دنیا کے لیے کمایا تھا وہ دنیا ہی میں رہ گیا، آخرت کے لیے کچھ کما کر لائے ہی نہیں کہ یہاں اس کے پھل کھا سکو؟ وہاں تمہیں اس کا کوئی موقع نہ ملے گا کہ از سرِ نو آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے اسی دنیا میں ہے۔ یہاں اگر تم آخرت کی فکر کیے بغیر ساری عمر دنیا ہی کی دھن میں لگے رہے اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں دنیوی فائدے تلاش کرنے ہی میں کھپا دیں، تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمہاری حالت بعینہٖ اُس بڈھے کی طرح حسرت ناک ہو گی جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالمِ پیری میں اُس وقت جل گیا جبکہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے[۱] اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو اللہ کو اس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں[۲]۔ اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے[۳]۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں[۴]۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال

(بقیہ صفحہ سابق) اور نہ اس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

[۱] ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہو وہ بُرے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش و عطا کے دریا بہا رہا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اخلاق لوگوں سے محبت کرے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا بلکہ اُس راہِ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریدوں کی نگاہ میں بڑی ہشیاری اور عقلمندی یہ ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر ہی میں لگا رہے۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے ان کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے، اور حکمت و دانائی ان کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اس سے اپنی متوسط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کرے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں دوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو، لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پوری زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جز ہے۔ اس چھوٹے سے جز کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ اور عقلمند دراصل وہ ہے جس نے اس مختصر زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر تھوڑے سرمایہ ہی سے اُس ہمیشگی کی زندگی میں اپنی خوشحالی کا بندوبست کر لیا۔

[۲] خرچ خواہ راہِ خدا میں کیا ہو یا راہِ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں تمہاری نیت اور تمہارے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ جنھوں نے اُس کے لیے خرچ کیا ہوگا اور اس کی خاطر (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس کی خبر ہے۔

لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو تو جو کچھ تم بھلائی کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں، تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں[۵۵]۔ ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ

(بقیہ صفحہ سابق) نذر مانی ہوگی وہ اس کا اجر پائیں گے۔ اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے نذریں مانی ہوں گی ان کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کر لے جو اس کے ذمہ فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہو تو ایسی نذر اللہ کی طاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اور اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔

[۵۳] جو صدقہ فرض ہو اس کو علانیہ دینا افضل ہے اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا علانیہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چھپا کر کرنا اولیٰ ہے۔

[۵۴] یعنی چھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اوصاف حمیدہ خوب نشوونما پاتے ہیں، اس کی بُری صفات رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اللہ کے ہاں اس کو اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے بھی ہیں انھیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۵] ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہل حاجت کی مدد کرنے میں تامل کرتے تھے (باقی صفحہ آئندہ پر)

ع۳۷ نہ رہے گا۔

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سود[1] کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو[2]، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "تجارت

(بقیہ صفحہ سابق) اور ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اُتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے، اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ رہا دنیوی مال و متاع سے ان کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تامل نہ کرو کہ انھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے اس کا اجر اللہ تمھیں دے گا۔

ﷺ اس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی معاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس قسم کے رضاکاروں کا ایک مستقل گروہ تھا جو تاریخ میں اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے جو اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے، ہمہ وقت حضور کے ساتھ رہتے تھے، ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے، حضورؐ جہاں چاہتے انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینہ سے باہر کوئی کام نہ ہوتا اس وقت یہ مدینہ ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اصل میں لفظ ربوٰ استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی لغت میں زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ اصطلاحاً اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے۔ اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنھیں اہل عرب "ربوٰ" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا، اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ یا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع

(باقی صفحہ آئندہ پر)

بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے"،[1] حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔[2] لہٰذا جس شخص کو

(بقیہ صفحہ سابق) اضافہ کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ اسی نوعیت کے معاملات کا حکم یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

[۵] اہل عرب دیوانے اور پاگل آدمی کو "مجنون" (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے تو یوں کہتے کہ اسے جن لگ گیا ہے۔ اسی محاورہ کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سود خوار کو اس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے اسی طرح سود خوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سود خواری سے کس کس طرح انسانی محبت، اخوت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اس دنیا میں ہے، اور چونکہ آخرت میں انسان اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس حالت پر اس نے دنیا میں جان دی ہے، اس لیے سود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باؤلے، مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اٹھے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ان کے نظریہ کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے اس کی نوعیت اور سود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت کا منافع جائز ہے تو سود کیوں ناجائز ہو۔

[۲] تجارت اور سود کا اصولی فرق، جس کی بنا پر دونوں کی معاشی اور اخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اُس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اُس نے بائع سے خریدی ہے، اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اُس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اُس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے[۱]، اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو بہر طور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدہ کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائل معیشت حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایہ میں اصل شے جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہ کرایہ دار کو واپس دیدی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اُس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافہ کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اُس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔

ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے اور ہمدردی و امداد باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوع انسانی کے لیے تباہ کن ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ اس نے کھا لیا اسے اللہ معاف کر دے گا بلکہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ "جو کھا چکا سو کھا چکا" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کھا چکا اسے معاف کر دیا گیا بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے۔ یعنی جو سود پہلے کھایا جا چکا ہے اسے واپس دینے کا قانوناً (باقی اگلے صفحہ پر)

کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا مُنھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔[۵۱]
اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔[۵۲] ہاں جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور

(بقیہ صفحہ سابق) مطالبہ نہیں کیا جائیگا کیونکہ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جاکر ختم نہ ہو۔ مگر اخلاقی حیثیت سے اس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی جو کسی شخص نے سودی کاروبار سے سمیٹا ہو اگر وہ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والا ہوگا اور اس کا معاشی و اخلاقی نقطۂ نظر واقعی اسلام قبول کرنے سے تبدیل ہو چکا ہوگا تو وہ خود اپنی اس دولت کو جو حرام ذرائع سے آئی تھی اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حقداروں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے جن کا مال اس کے پاس ہے، اس حد تک ان کا حق انھیں واپس کر دیا جائے، اور جس حصۂ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے اسے اجتماعی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی سزا سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اٹھاتا رہے، تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پاکر رہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی محدود نگاہ رکھنے والے لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے نزدیک سود سے دولت بڑھتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہے۔ لیکن درحقیقت سود دولت کو گھٹاتا ہے اور صدقات سے دولت کو نشوونما حاصل ہوتا ہے۔ سود کا خاصہ یہ ہے کہ پوری سوسائیٹی کی دولت سمٹ سمٹ کر ایک محدود اور محدود تر طبقہ میں اکٹھی ہوتی چلی جائے اور سوسائیٹی کا اکثر اور کثیر تر طبقہ کم سے کم وسائل زندگی سے بھی محروم ہوتا جائے۔ یہ چیز بالآخر پوری سوسائیٹی کے لیے تباہی کی موجب بن جاتی ہے اور اس تباہی سے وہ طبقہ بھی نہیں بچ سکتے جن کے پاس سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے۔ برعکس اس کے صدقات دولت کو عام باشندوں میں پھیلاتے ہیں، اور اس سے اجتماعی دولت بڑھتی ہے۔ اگر فی الواقع محض خدا کی خوشنودی کے لیے، ریا اور نام و نمود اور خودغرضی سے پاک ہو کر، اجتماعی فلاح و بہبود اور انفرادی اعانت و ہمدردی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کی عادت لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ چیز عام خوشحالی کی موجب بن جاتی ہے۔ پھر چونکہ آخرت کی زندگی اسی دنیوی زندگی کے اعمال کا اخلاقی نتیجہ ہے اس لیے سود کا زوال اور صدقات کا نشوونما وہاں اور زیادہ نمایاں صورت میں ہوگا۔

[۵۲] ظاہر ہے کہ سود پر روپیہ وہی شخص چلا سکتا ہے جس کو دولت کی تقسیم میں اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ حصہ ملا ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ حصہ جو ایک شخص کو ملتا ہے، قرآن کے نقطۂ نظر سے دراصل یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ کے فضل کا صحیح شکریہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے اسی طرح وہ بندہ بھی اس کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس خدا کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ جو بندے دولت کی تقسیم میں اپنی ضرورت سے کم حصہ پا رہے ہیں ان کے قلیل حصہ میں سے بھی اپنی دولت کے زور پر ایک ایک جز اپنی طرف کھینچ لے، (باقی اگلے صفحہ پر)

نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔[۱]

اے ایمان لانے والو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔[۲] اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو، اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اُس دن کی رسوائی و مصیبت سے بچو جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ سابق) وہ حقیقت میں ناشکرا بھی ہے اور ظالم، جفا کار، بدعمل بھی۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اس رکوع میں اللہ تعالیٰ بار بار دو قسم کے کرداروں کو بالمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک کردار خود غرض، زر پرست، شائیلاک قسم کے انسان کا ہے جو خدا اور خلق دونوں کے حقوق سے بے پروا ہو کر روپیہ گننے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے اس کو بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں منہمک ہو۔ دوسرا کردار ایک خدا پرست، فیاض اور ہمدرد انسان کا کردار ہے جو خدا اور خلقِ خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو، اپنی قوتِ بازو سے کما کر خود کھائے اور دوسرے بندگانِ خدا کو کھلائے اور دل کھول کر نیک کاموں میں خرچ کرے۔ پہلی قسم کا کردار خدا کو سخت ناپسند ہے، دنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی اور آخرت میں ایسے کردار کے لیے غم و اندوہ اور کلفت و مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کو دوسری قسم کا کردار پسند ہے، اسی سے دنیا میں صالح سوسائٹی بنتی ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجبِ فلاح ہے۔

[۲] یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اس سلسلۂ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے نزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم بن گیا۔ چنانچہ جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کے ذریعہ سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اسی طرح (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو[۵۴] تو اسے لکھ لیا کرو[۵۵]۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو اُسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) اور اُسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں میں[۵۶] سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو[۵۷]۔ گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے

(بقیہ صفحہ سابق) نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدۂ صلح ہوا تو اس میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا، اور ہمارے اور تمہارے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابن عباس، حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دارالاسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہاء کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اُسے چھوڑا نہ جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۴] اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملہ میں مدت کا تعین ہونا چاہیے۔

[۵۵] عموماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب، اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے، لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قرار دادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرا لینی چاہیے تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں مگر ان کی فریاد سنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بد خلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ اور تیسرا وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

[۵۶] ان الفاظ سے بعض فقہا نے یہ سمجھا ہے کہ گواہ مسلمان ہی ہونے چاہییں لیکن امام ابو حنیفہ غیر مسلم کی شہادت کو بھی جائز رکھتے ہیں۔

[۵۷] مطلب یہ ہے کہ ہر کس و ناکس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ (باقی اگلے صفحہ پر)

تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمھارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمھارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں[۵۱]، مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے[۵۲]۔ ایسا کرو گے تو نافرمانی کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو، وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو[۵۳]۔

اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ، اپنے رب سے ڈرے۔

(بقیہ صفحہ سابق) کیا جائے جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روزمرہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملۂ بیع کا تحریر میں آجانا بہتر ہے، جیسا کہ آج کل کیش میمو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں۔

۵۲ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

۵۳ یہ مطلب نہیں ہے کہ رہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملۂ رہن کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے لے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند (باقی اگلے صفحہ پر)

اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ[1]، جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہوتا ہے، اور اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ ع

آسمانوں[2] اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[3]۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے گا[4]، پھر اُسے اختیار ہے جسے چاہے معاف کردے اور جسے چاہے سزا دے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[5]۔

رسول اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے، اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے

(بقیہ صفحہ سابق) آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضہ میں شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ البتہ دودھ دینے والے جانور کا دودھ استعمال کر سکتا ہے اور سواری کے جانور پر وہ سوار بھی ہو سکتا ہے مگر یہ دراصل اُس چارے کا معاوضہ ہے جو وہ اس جانور کو کھلاتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر "شہادت چھپانے" کا اطلاق ہوتا ہے۔

[2] یہ خاتمہ کلام ہے۔ اس لیے جس طرح سورۃ کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا اسی طرح سورۃ کو ختم کرتے ہوئے بھی اُن تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے۔

[3] یہ دین کی اولین بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالک زمین و آسمان ہونا اور اُن تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں اللہ ہی کی ملک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دے۔

[4] اس فقرے میں دو باتیں اور ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمہ دار (باقی اگلے صفحہ)

رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی، مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔[۱۱]

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔[۱۲] ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔[۱۳]

(بقیہ محۂ سابق) وہ جواب دہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بادشاہ زمین و آسمان جس کے سامنے آدمی جواب دہ ہے غیب و شہادت کا علم رکھتا ہے حتیٰ کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۱۰ یہ اللہ کے اختیار مطلق کا بیان ہے۔ اس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو، بلکہ وہ مالک مختار ہے، سزا دینے اور معاف کرنے کے کلی اختیارات اس کو حاصل ہیں۔

(حواشی صفحۂ ہذا) ۱۱ اس آیت میں تفصیلات سے قطع نظر کر کے اسلام کے عقائد اور اسلامی طرز عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو ماننا، اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)، اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخر کار ہمیں اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے، یہ پانچ اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ اور مسلمان کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے اُسے بسر و چشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حسن عمل پر غرّہ نہ کرے بلکہ اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔

۱۲ یعنی اللہ کے ہاں انسان کی ذمہ داری اس کی مقدرت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پرس کرے کہ تو نے فلاں کام کیوں نہ کیا، یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اُس کی قدرت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مواخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی مقدرت کا فیصلہ کرنے والا انسان خود نہیں ہے، اس کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی نہ رکھتا تھا۔

۱۳ یہاں اللہ کے قانون مجازات کا ایک دوسرا قاعدہ کلیہ ارشاد ہوا ہے۔ ہر آدمی انعام اسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو، یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات (باقی اگلے صفحہ پر)

(ایمان لانے والو تم یوں دعا کیا کرو) مالک! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں اُن پر گرفت نہ کر۔ آقا! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے[1]۔ پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں وہ ہم پر نہ رکھ[2]، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگذر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے پس کافروں کی جماعت کے مقابلہ میں ہماری مدد کر[3]۔

(بقیہ سابق) چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامہ میں لکھے جائیں، اور ایک دوسرے شخص نے کسی بُرائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالم اول کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا بُرا جو کچھ بھی پھل ہوگا اسی کی سعی اور اسی کے کسب کا نتیجہ ہوگا۔ بہرحال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس بُرائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی ہمارے پیش رووں کو تیری راہ میں جو آزمائشیں پیش آئیں، جن زبردست ابتلاؤں میں سے وہ گذرے جن مشکلات سے انھیں سابقہ پڑا، اُن سے ہمیں بچا۔ اگرچہ اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق و صداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے اسے سخت آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، اور جب آزمائشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے، لیکن بہرحال مومن کو اللہ سے دعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ حق پرستی کی راہ کو آسان کر دے۔

[2] یعنی مشکلات کا اتنا ہی بار ہم پر ڈال جسے ہم سہار لے جائیں، آزمائشیں بس اتنی ہی بھیج کہ ان میں ہم پورے اُتر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری قوت برداشت سے بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہِ حق سے ڈگمگا جائیں۔

[3] اس دعا کی پوری روح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں جبکہ مکہ میں کفر و اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی میں نہیں بلکہ سرزمین عرب میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندۂ خدا نے دین حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی زمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ اِن حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دعا اُس وقت مسلمانوں کیلیے غیر معمولی تسکین قلب کی موجب ہوئی۔ علاوہ بریں اس دعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بہنے دیں بلکہ انھیں اِس دعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک طرف اُن روح فرسا مظالم کو دیکھیے جو محض حق پرستی کے جرم میں اِن لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دوسری طرف اِس دعا کو دیکھیے جس میں دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک طرف اُن جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دوسری طرف اِس دعا کو دیکھیے جس میں کسی دنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے۔ ایک طرف ان حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے اور دوسری طرف اُن بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے جن سے یہ دعا لبریز ہے۔ اس تقابل ہی سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت اہل ایمان کو کس طرز کی اخلاقی و روحانی تربیت دی جا رہی تھی۔

جماعتِ اسلامی کی حقیقت اور ہمارے کام کی نوعیت

بعض شبہات کا جواب

(از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی)

("جماعتِ اسلامی" کے متعلق ایک صاحبِ علم بزرگ نے اپنے ایک طویل خط میں کچھ خیالات ظاہر فرمائے تھے۔ اس کا جو جواب دیا گیا وہ بھی طویل ہو گیا۔ اس جواب کا ایک حصہ جو عمومی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے سوالات کے جواب میں ہے جو بہت سے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں اور جس سے جماعت کے متعلق انشاء اللہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں ہدیۂ ناظرین کرام کیا جاتا۔ امید ہے کہ اس سے "جماعتِ اسلامی" کی اصلی حیثیت کے سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

چونکہ اہلِ نظر اس جواب ہی سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ سوال کیا تھا؟ اس لیے اُس "سوال نامہ" کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی سلام مسنون! مزاجِ گرامی؟

....

میرے خیال میں "جماعتِ اسلامی" پر غور کرتے وقت ہمارے اِن بنیادی تصورات کو ضرور سامنے رکھ لینا چاہیے جو تاسیس و تشکیلِ جماعت کے لیے اصل عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں، جو ہمارے اس اقدام کے لیے بمنزلہ بنیادی محرکات کے ہیں ۔۔۔ وھی ھذہ:-

(الف) اسلام اپنے ماننے والوں سے جس طریقِ زندگی اور اقامتِ دین و اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جس جدوجہد کا

مطالبہ کرتا ہے وہ پورا نظام "طولِ اَمَد"[1] اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے درہم برہم ہو چکا ہے اور بظاہر اسباب اسی وجہ سے عملی دنیا میں "اسلام" "جاہلیت" سے مغلوب ہو رہا ہے۔ اب اس کے کچھ متفرق اجزاء اور منتشر حصے ضرور باقی ہیں، کچھ مسجدوں میں، کچھ مدرسوں میں، کچھ خانقاہوں میں اور کچھ بعض خوش نصیب دینداروں کی انفرادی اور گھریلو زندگی میں بھی لیکن وہ پوری چیز یقیناً موجود نہیں رہی جو اسلام کا مقصد اور مقتضیٰ تھا اور ایمانداروں کو جس پر قائم اور جس کے لیے سرگرمِ عمل ہونا چاہیے تھا۔

(ب) اب کچھ لوگ از خود یا کسی کی تذکیر سے اپنی اور عام امتِ مسلمہ کی اس تقصیر کو محسوس کرکے اپنا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے اپنی کوششوں کو منظم اور مجتمع کرکے زیادہ موثر اور طاقتور بنانے کے لیے نیز اسلام نظم اور اجتماعیت کی جو ہدایت کرتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے کو ایک جماعت بنا لینا ضروری سمجھا اور اسلامی تعلیم کے مطابق اپنا ایک امیر بھی منتخب کر لیا جس کے زیرِ قیادت وہ اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں لیکن اس جماعت کی حیثیت بس ایک حزب اور پارٹی کی ہے جو ایک مقصدِ خیر اور اس کے طریقِ کار پر متفق ہو گئی ہے۔ نہ یہ کل "امتِ مسلمہ" ہے اور نہ حق وایمان اور خدمتِ دین کو اپنا اجارہ اور اپنے میں منحصر سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اس کو یقین ہے کہ اس کے دائرے سے باہر بھی حق وایمان کے حامل اور دین کے سچے خادم موجود ہیں۔

(ج) "ان لوگوں" کے سامنے اس وقت دو کام ہیں۔ ایک اپنی اصلاح اور اپنی زندگی کا تزکیہ۔ اور دوسرے اور لوگوں کو بھی یہ پیغام پہنچانا اور ان کو بھی اس فریضہ کی طرف متوجہ کرنا، اور اس طرح اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے مقصد کے لیے طاقت بھی مہیا کرنا۔

(د) اب جو "دوسرے لوگ" ہیں تو ابتدائی تقسیم کے لحاظ سے وہ دو قسم کے ہیں، ایک "مسلمان" اور دوسرے "غیر مسلم" (بجمیع اصنافہم)۔ جو مسلمان کہلانے والے ہیں ان میں قطعاً و یقیناً مندرجہ ذیل قسموں کے

[1] یعنی بعد عہدِ نبوت۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں اہلِ کتاب کی گمراہی کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا "فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ"۔

عناصر موجود ہیں اور شواذ کے درجہ میں نہیں، بلکہ ہر عنصر کے لاکھوں افراد آپ کو ہماری ہی "اسلامی دنیا" میں مل سکتے ہیں:۔

(۱) حقیقی ایمان و صلاح رکھنے والے، جو علماً و اعتقاداً بھی مومن ہیں اور عملاً و فعلاً بھی (جیسا کہ جاہلیت سے مغلوب، اِس فاسد ماحول میں کوئی آدمی "مومنِ صالح" ہوسکتا ہے)

(۲) اعتقاداً مومن لیکن عملی حالت نہایت ابتر، فسق و فجور کے درجہ کو پہنچی ہوئی (علی اختلاف مراتبہم)

(۳) "عبادات" اور "اذکار و اشغال" تک ہی انہماک رکھنے والے رہبانیت پسند صوفی منش جن میں سے اکثر سخت درجہ گمراہانہ عقائد میں مبتلا ہوتے ہیں، مثلاً ہمارے زمانہ کے بہت سے "نیک نیت صوفی" اور ان کے معتقدین جن میں قبر پرستی اور پیر پرستی جیسے وجباتِ شرک بھی موجود ہیں۔

(۴) مغربی الحاد کے برباد کیے ہوئے ملاحدہ (علی اختلاف اصنافہم و مراتبہم)

(۵) خوجے، بوہرے اور اسمٰعیلی اور اثنا عشری شیعہ اور قادیانی جیسے فرقِ ہالکہ جنھوں نے اپنے کو امت کے اندر رکھتے ہوئے ایک مستقل مذہبی ملت کی شکل اختیار کرلی ہے۔

(۶) وہ عوام مسلمان جو اتنا جانتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اللہ ایک ہے اور اس کا رسول برحق، قیامت اور جزا سزا پر بھی ان کا ایمان ہے، نماز روزہ کر بھی لیتے ہیں اور نہیں بھی کرتے، غرض ان کا ایمان بہت مجمل ہے اور عمل بھی بہت ناقص، اسی کے ساتھ وہ بہت سی خرافات و توہمات کو دین و مذہب بھی سمجھے ہوئے ہیں۔ غرض فی الجملہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ دین کے حقیقی تصور سے ناآشنا ہیں، اور اس کے خاص تقاضوں اور مطالبوں سے بالکل بے خبر، ایسے کہ اگر آپ ان سے کہیں کہ اسلام میں "حاکمیت" صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اور "اقتدار اعلیٰ" بس اللہ کا ہونا چاہیے اور جو اشخاص یا جو جماعتیں قانونِ الٰہی سے بے نیاز ہوکر آج اللہ کی زمین پر حکمرانی کررہی ہیں اُن کی حیثیت "طواغیت" اور باغیانِ خدا کی ہے، اور ان کی اس حاکمانہ حیثیت کو قبول کرلینا اور اس پر راضی رہنا بلکہ اس کے استیصال کی

فکر سے غافل رہنا بھی "اسلام" کی نظر میں انسان کی معصیت ہے، تو وہ حیرت سے آپ کا منہ تکیں گے۔ —— (بلکہ یہ حال تو بہت سے پڑھے لکھے "دینداروں" کا بھی آپ پائیں گے اور میں نے پایا ہے)

(۷) وہ عوام جو "ضروریاتِ دین" تک سے ناواقف ہیں، وہ بس اتنا جانتے ہیں کہ جیسے ہندو ہندو ہیں ویسے ہم مسلمان ہیں اور "مسلمان" وہ ہے جو مسلمان ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ کلمۂ اسلام کے مفہوم تک سے ناآشنا ہیں، بلکہ بہت سے اُن میں سے اس کے تلفظ سے بھی عاجز ہیں۔

غرض امتِ مسلمہ میں یہ تمام عناصر موجود ہیں۔ میرے اندازہ میں باعتبار تعداد ان میں سب سے کم پہلا عنصر اور سب سے زیادہ آخر اور ماقبل آخر۔

(ھ) اب جو جماعت مندرجہ صدر مقاصد کو لے کر کھڑی ہوئی ہے، یا جو لوگ ان ارادوں کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ان تمام مسلمان کہلانے والوں کو آپ کی اصطلاح میں "اُمتِ نبی" مانتے ہوئے اپنے "نصب العین" کے لیے جدوجہد کی دعوت دیں —— (جیسا کہ مثلاً فلاں فلاں[1] اسلامی جماعتوں کا طرزِ عمل ہے کہ اپنے مقاصد اور "نصب العین" کو سامنے رکھ کر وہ ہر مسلمان کو دعوت دیتے ہیں اور سب کی بھرتی کرتے ہیں۔ انھیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُن کی اعتقادی یا عملی حالت کیا ہے اور اُن کو "اصولِ ایمان" اور "ضروریاتِ دین" تک کا بھی شعور ہے یا نہیں۔ یعنی ان کی دعوت "مسلمان قوم" کو ہے) تو ایک طریقہ تو یہ ہے کہ "اعلائے کلمۃ الحق" اور "اقامتِ دین" کو نصب العین بنانے والی، اور اس راہ میں جو فریضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان پر عائد ہوتا ہے اس کو ادا کرنے ہی کی نیت سے کھڑی ہونے والی یہ جماعت بھی اسی طریقہ پر پوری "مسلمان قوم" کو بلا کسی امتیاز کے اس مقصد کے لیے اپنے ساتھ جدوجہد کرنے کی دعوت دے، اور اسی ٹائپ کی ایک اور جماعت بنا کر کام شروع کر دے۔ نہ وہ یہ شرط لگائے کہ اس کے رفقا اور

[1] یہاں اصل خط میں مسلمانوں کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے نام تھے۔

سپاہیوں میں "ایمان" اور اس کا شعور ہونا چاہیے اور نہ یہ کہ ان کی عملی زندگی اور ان کا کیرکٹر کسی درجے میں تو اسلامی ہو۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پورے اجتماع میں سے ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے جو دین کا ضروری علم و شعور رکھتے ہوں، ان کی زندگی کو اس اعلیٰ اور مقدس مقصد سے فی الجملہ مناسبت ہو اور اس مشن کے لیے جس طرح اور جس انتظام کے ساتھ آگے بڑھنا ہو اس کے نباہنے کی فی الجملہ صلاحیت ان میں موجود ہو ـــ اور جن افراد میں یہ باتیں بھی موجود نہیں ہیں اُن میں تبلیغ و تذکیر کے ذریعہ پہلے یہ باتیں پیدا کی جائیں، پھر ان کو اس راہ میں جدوجہد کرنے کے لیے دعوت دی جائے اور اس تبلیغ اور دعوت الی اللہ کا دائرہ صرف "مسلمانوں" اور کلمہ گویوں ہی تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ جو غیر مسلم ہیں، اُن تک بھی اللہ کا پیغام پہنچایا جائے اور پھر اُن میں سے جو خوش بخت اس کو قبول کرلیں اُن کو بھی اس نصب العین کے لیے حرکت کرنے اور اس راہ پر چلنے کی دعوت دی جائے۔ پھر جتنے لوگ اس کوشش کے نتیجہ میں اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ ہوں وہ ایک طرف تو اپنی زندگی کو ایک مومن کی سی زندگی بنانے کی کوشش کریں اور دوسری طرف دوسروں کو بھی دعوت دینے اور اس طرح اس تحریک کو آگے بڑھانے میں لگ جائیں۔

(۵) ہم لوگوں نے اسی آخر الذکر طریقہ کو صحیح سمجھا ہے۔ اور میرے نزدیک بس یہی ہے حاصل ہمارے عزائم ہمارے اس وقت کے کام اور ہمارے فرائض کا ـــ جماعت کے دستور وغیرہ میں اس کے سوا کچھ نہیں، جو کچھ ہے بس اسی کی تفصیلات اور جزئی تفریعات یا اس کے لوازم اور تقتضیات ہیں ـــ اس "جماعت" کی تاسیس اور تشکیل کے ذریعہ ملت سے الگ اپنا کوئی "جماعتی تشخص" قائم کرنا چاہتے ہیں اور نہ خدانخواستہ کسی "فرقہ وارانہ ہیکل" کی تعمیر ہمارا مقصد ہے اور نہ ہم اپنے کو دوسروں سے اچھا مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس قسم کی گمراہیوں سے ہم ہزار بار خدا کی پناہ چاہتے ہیں "جماعت" کی تاسیس کے

پہلے دن بھی اس بارہ میں ہم نے اپنے ذہنوں کو صاف کر لیا تھا اور بعد میں بھی اس خطرہ سے برابر ہشیار رہے ہیں ــــ "جماعت اسلامی" کے پہلے اجتماع کی روداد ہی کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ ایک "فرقہ" بننا نہیں چاہتے بلکہ اس خطرہ سے پوری طرح ہشیار بھی ہیں (ملاحظہ ہو روداد اجتماع ص۲۹ و ص۳۰ جہاں مولانا مودودی نے خود ہی جماعت کو اس خطرہ سے ہشیار کیا ہے اور خدانکردہ رفقاء جماعت کو اس بارہ میں جو غلط فہمی ہو سکتی تھی اور جس راستہ سے وہ آسکتی تھی اُس تک کا انسداد کر دیا ہے اور سخت ترین تاکید کی ہے کہ جماعت کے ارکان کو ایسے تمام طریقوں سے پرہیز کرنا چاہیے جو ان کو مسلمانوں میں ایک "فرقہ" بنانے والے ہوں الخ ص۳۰)

بہرحال اس معاملہ میں ہمارا ذہن اور ہمارا معاملہ بھی الحمد للہ بالکل صاف ہے اور ہم غالباً دوسروں سے زیادہ اس کی اہمیت اور خطرناکی کو سمجھتے ہیں۔

اس کے باوجود ہمارے بعض خاص کرمفرما ناقدین اور معترضین نے اپنے اس خطرہ کو ظاہر کیا ہے یا دوسروں کو اس شبہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ "جماعت اسلامی" گویا ایک نیا مذہبی فرقہ پیدا ہو رہا ہے جس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ گویا اب تک ہم "صاحب ایمان" نہیں تھے، اور اب اس "جماعت" میں شامل ہو کر "مومن" بن رہے ہیں، اور اسی طرح جو دوسرے عام مسلمان ہیں وہ "مومن" نہیں ہیں اور اب ہم کو انھیں "دعوت ایمان" دینی اور "مسلمان" کرنا ہے ــــ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس قسم کے غالیانہ تخیلات اور وساوس سے شاید ان معترضین سے بھی زیادہ بیزار اور پُرحذر ہیں۔

خود میری اپنی سرگذشت یہ ہے کہ جس دن سے ہوش سنبھالا اور دینی شعور حاصل کیا ہے الحمد للہ "ایمان" کی نعمت اُسی دن سے ساتھ ہے، اور خدمت دین اور دعوت الی اللہ کا کام بھی جو بن پڑا انفرادی طور پر اپنی سمجھ اور فکر کے مطابق کرتا رہا۔ اب "جماعت اسلامی" کی دعوت نے جب ایک اچھی اجتماعی جد و جہد کی راہ دکھائی تو اس کو قبول کر لیا۔ بس یہی ہے میرا اور مجھ جیسے دوسرے رفقاء جماعت کا بھی حال۔

مولانا مودودی کی ذاتی سرگذشت اگر اس سے مختلف ہے (جیسا کہ روداد اجتماع سے آپ نے سمجھا ہے) تو وہ ان کا ذاتی حال ہے ساری جماعت کے لیے کوئی مقررہ اصول تو نہیں ہے۔

(۳) علی ہذا ہم کو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ اس "جماعت" میں آنا شرطِ ایمان ہے، یا یہ کہ نجات اور رضاء الٰہی حاصل کرنے کے لیے اس جماعت سے وابستہ ہونا ضروری ہے جماعت کے پہلے اجتماع کی روداد" ہی میں یہ عبارت بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی :-

"خوب سمجھ لیجیے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہے بلکہ ہماری صحیح حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظامِ جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے مگر بعد میں اس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لیے جو لوگ اٹھیں ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو۔ ایسی جماعتیں بیک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں"۔ (روداد اجتماع اول صفحہ)

پھر اس کے بعد" ترجمان القرآن" میں بھی ایک دفعہ سے زیادہ اس کے متعلق تصریحات کی گئی ہیں چنانچہ رجب و شعبان کے" ترجمان" میں اس شبہ اور اس کے جواب کا ذکر آپ نے ان الفاظ میں ملاحظہ فرمایا ہوگا :-

"ایک اور شبہ لوگوں کے دلوں میں یہ ہے کہ عام جماعتوں کی طرح ہماری دعوت بھی شاید اپنی جماعت ہی کی طرف ہے، اور یہ کہ جو لوگ ہم سے الگ ہیں اُن کو ہم مطلقاً حق پر سمجھتے ہی نہیں .....

دراصل ہماری دعوت اُس مخصوص نظامِ جماعت کی طرف نہیں ہے جو ہم نے قائم کیا ہے بلکہ

عقیدۂ توحید و رسالت اور اُس نصب العین کی طرف ہے جو اللہ کو اپنا بادشاہ اور رسول کو اپنے بادشاہ

کا ماننا اور تسلیم کرنے کے ساتھ ہی لازماً ہر مسلمان کا نصب العین قرار پاتا ہے ...... اب جو لوگ اس عقیدہ و نصب العین میں ہم سے متفق ہیں اُن کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ ہمارے نظامِ جماعت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور ہم پر بھی اطمینان رکھتے ہیں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں، اور اگر ہمارے نظام سے یا ہماری شخصیتوں سے وہ مطمئن نہیں ہیں تو خود اس کارِ خیر کے لیے کوئی جماعت بنائیں اور اپنی صوابدید کے مطابق جدوجہد کریں۔ دونوں صورتیں یکساں صحیح اور برحق ہونگی۔ ایسی دس جماعتیں بھی اگر بن جائیں جن کا عقیدہ اور نصب العین یہی ہو اور نظام مختلف ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہمیں ان سے رقابت نہ ہوگی، بلکہ مسرت ہوگی کہ الحمد للہ اس راستہ پر چلنے کے لیے اور قافلے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چاہے ابتداءً ہم الگ ہی چلیں، مگر مسلک و مقصد کی وحدت انشاء اللہ سب کو ایک کر دے گی۔ اور کم از کم اپنی حد تک تو ہم یقین دلانے کے لیے تیار ہیں کہ اس امرِ حق کی خدمت کے لیے کوئی دوسری جماعت وجود میں آئے تو اس کے ساتھ ہم بخوشی تعاون کریں گے اور اگر اُس کے نظام اور کارفرما اشخاص کو ہم نے صالح تر پایا تو ہمیں اپنے جداگانہ وجود کو ختم کر کے ان کے اندر جذب ہو جانے میں بھی ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔" (ترجمان القرآن بابت ماہ رجب، شعبان و رمضان سنہ ۱۳۶۰ھ صفحہ ۵)

نیز اسی بارہ میں حیدر آباد دکن کے ایک صاحب کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا تھا کہ:-

"جو شخص دینِ حق کو مغلوبی کی حالت سے نکالنے اور پوری جنسِ دین پر اسے غالب کرنے کی جدوجہد کرے وہ بہرحال ہمارے نزدیک حق پر ہے خواہ ہماری جماعت میں شریک ہو یا ہم سے الگ رہ کر اس مقصد کے لیے کام کرے، اور جو ایسا نہیں کرتا اس کو ہم عند اللہ قابلِ مواخذہ سمجھتے ہیں۔"

("صدق" ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء بحوالہ اخبار "مسلمان" لاہور)

بہرحال یہ تو کبھی ہمارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آیا اور نہ انشاء اللہ آ سکتا ہے کہ "جماعت

اسلامی" میں شامل ہونا "شرائطِ ایمان" یا "ضروریاتِ اسلام" میں سے ہے اور جو لوگ ہم سے الگ ہیں وہ خدانخواستہ ہمارے نزدیک "غیر مومن" ہیں یا عدمِ شمولیتِ جماعت کی وجہ سے اُن کے ایمان واسلام میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔ اس قسم کے توہمات کو بھی ہم بدترین قسم کی گمراہی سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس ہم بہت سے اللہ کے اُن بندوں کو جانتے ہیں جو اس جماعت کے رکن نہیں ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ اس زمانہ کے لحاظ سے "ایمان" اور "عمل صالح" کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں، اور ان کا تقویٰ اور تورع ہمارے لیے قابلِ رشک اور لائقِ تقلید ہے۔

الغرض "جماعتِ اسلامی" کے نظام میں باضابطہ منسلک ہونا اور اس خاص آرگنائزیشن سے وابستہ ہونا کسی شخص کے مومن بلکہ صالح ہونے کے لیے بھی ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ایمانی فریضہ اس سلسلہ میں صرف اتنا ہے کہ "جماعتِ اسلامی" کا جو عقیدہ اور نصب العین ہے، ہر مومن کا وہی عقیدہ اور وہی نصب العین ہو، اور اس کے لیے وہ اپنی جدوجہد سے غافل نہ رہے، خواہ وہ یہ کام ہمارے ساتھ ہو کر کرے یا ہم سے الگ رہ کر۔ اس اصل میں موافقت کے ساتھ عملی پروگرام کی تفصیلات میں اگر کہیں ہم سے کچھ اختلافِ رائے بھی ہو تو ہم اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔۔۔ غور فرمائیے! کیا ایک "نیا مذہبی فرقہ بنانے والوں" اور دوسروں کو "غیر مومن سمجھ کر دعوتِ ایمان دینے والوں" کا حال یہی ہوتا ہے؟

(ج) ہاں معترضین کے اعتراض کے بعد ہی ہم میں سے بعض کو بھی یہ محسوس ہوا کہ "جماعتِ اسلامی" کے دستور میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے کم غور کرنے والوں کو اس قسم کے شبہات ہو سکتے ہیں یا اعتراض و تنقید ہی کی نظر سے دیکھنے والے اُن سے ایسا سمجھ سکتے اور دوسروں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے ہیں، چنانچہ فروری کے اجتماع میں ہم لوگوں نے اسی غرض سے "دستور" پر نظرثانی کی اور جن الفاظ میں ہم نے اس قسم کے اشتباہ کی گنجائش محسوس کی ان میں مناسب ترمیم کر دی۔ دستور

کا نیا ایڈیشن تیار ہونے پر آپ اُن تمام ترمیمات کو ملاحظہ فرمالیں گے۔

(ط) بعض حضرات دستور کے لفظ "تجدید ایمان" سے بھی یہ شبہ پیدا کرتے ہیں اور آپ کے گرامی نامہ میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک عام اور معروف دینی اصطلاح ہے جس سے لوگوں کو واقف ہونا چاہیے اس لیے ہم نے اس کو بدلنا اچھا نہ سمجھا۔ "تجدید ایمان" کا لفظ تو خود "ایمانِ سابق" کا پتہ دیتا ہے۔ نیز حدیثِ نبوی میں بھی خود اہلِ ایمان سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا کہ :-

جَدِّدُوا اِیمانکم ! تم لوگ اپنے ایمان کی تجدید اور اس کو تازہ کرتے رہو۔

قیل یا رسول اللہ کیف نُجَدِّد ایماننا؟ عرض کیا گیا حضرت! ہم کس طرح اپنے ایمانوں کی تجدید کریں؟

قال اکثروا من قولِ لا اِلٰہ الا اللہ۔ ارشاد فرمایا لا الٰہ الا اللہ کہنے کی کثرت رکھو۔

(رواہ احمد عن ابی ہریرۃ مرفوعاً، جمع الفوائد ص ۱۵ ج ۱)

(ی) دستور میں ایک جگہ "از سرِ نو ایمان لانے" کا لفظ ہے (جو آپ کو زیادہ کھٹک رہا ہے) میں اس کے اور "تجدید ایمان" کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں وہ "تجدید ایمان" کا ترجمہ ہی ہے۔ اور اسی وجہ سے "دستور" پر نظرِ ثانی کے وقت ہم نے اس میں کوئی ترمیم کرنی ضروری نہیں سمجھی۔ لیکن بعد میں چونکہ اور بھی ایک دو صاحبوں نے اس کے بارے میں وہی خیال مجھ سے ظاہر کیا تھا جو آپ کو پیدا ہو رہا ہے اس لیے اب میں اس لفظ کو بھی بدل دینا ہی بہتر سمجھتا ہوں اور اب سے پہلے مولانا مودودی کو اپنا یہ مشورہ لکھ کر بھیج چکا ہوں کہ اس کی جگہ بھی وہ "تجدید ایمان" ہی کا لفظ کر دیں۔

(ک) داخلۂ جماعت کے وقت "ادائے شہادتین" کا جو طریقہ رکھا گیا ہے اس کے متعلق بھی ایک سے زائد مرتبہ یہ تصریح کی جا چکی ہے کہ یہ التزام اس تصور پر مبنی نہیں ہے کہ پہلے سے شہادتین پر اس شخص کا ایمان نہ تھا یا خدا نخواستہ ہم ایمانِ سابق کو کالعدم سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا منشا صرف استحضار، اور ایمان کو تازہ کرنا ہے۔ نیز ایک غرض اس سے یہ بھی ہے کہ جو آئے وہ حقیقتِ ایمان اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھ بوجھ کر آئے۔ مولانا

مودودی نے اس کے متعلق خود لکھا ہے کہ :-

"جماعت اسلامی" کے دستور میں شہادتین کو شرط رکنیت قرار دینے کی غرض بھی صرف یہ ہے کہ جو لوگ ہر کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں ان کے متعلق یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صالح العقیدہ ہیں اور جاہلیت کی اُن آمیزشوں کو لیے ہوئے نہیں آرہے ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر گھس آئی ہیں۔ نیز یہ کہ دعوت الی اللہ کی خدمت شروع کرنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر اللہ کے ساتھ اپنے عہد و میثاق کو استوار کر لیں اور نو مسلمانہ جوش کے ساتھ کام کے لیے آگے بڑھیں۔" (ترجمان القرآن بابت ماہ رجب تا رمضان ۱۳۶۶ھ ص ۱۸۸)

نیز اس ناچیز راقم الحروف نے بھی اس "تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین" کے متعلق "الفرقان" میں لکھا تھا کہ :-

12/4/19

11-7-95

"اس تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین" کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ایمان لانے اور صدق دل سے سوچ سمجھ کر توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے سے جو ذمہ داریاں ایک مومن پر عائد ہوتی ہیں اُن کا احساس پھر تازہ ہو جائے اور ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے وہ اس جماعت میں داخل ہو جس کے داخلہ کی شرط بس ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کا عہد و پیمان ہی ہے ــــ نیز اس کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ خدا اور رسول پر واقعی ایمان رکھنے والے "مومنین صادقین" اور دین کے بنیادی اصولوں تک سے ناآشنا بلکہ اُن کے منکرین تک (جس طرح "مسلم سوسائٹی" کے مساوی درجہ کے ممبر سمجھے جاتے ہیں)، "یہ جماعت" اس طرح کے خلط ملط سے محفوظ رہے اور جو آئے خدا اور رسول پر ایمان رکھنے والا یا ایمان لانے والا ہی آئے۔ بہرحال "تجدید ایمان" اور سمجھ بوجھ کر "ادائے شہادتین" سے ہماری غرض صرف یہی ہے، نہ یہ کہ ہم دوسرے تمام مسلمانوں کو "غیر مومن" سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ ان اکون من الغالین۔

خود ہماری نگاہوں میں بہت سے ایسے ایمان و صلاح والے ہیں جن کا ایمان اور جن کا ورع و تقویٰ خود ہمارے لیے لائق تقلید نمونہ ہو سکتا ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اُن محاسن اعمال میں

اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔" (الفرقان ماہ شوال ۱۳۶۱ھ صفحہ ۴۸)

غور فرمایا جائے کیا ان واضح تصریحات کے بعد کسی کے لیے اس شک شبہ کی گنجائش رہتی ہے کہ ہم دوسروں کو ایمان سے خالی جان کر داخلہ جماعت کے وقت "اوا شہادتین" کا مطالبہ کرتے ہیں؟ بڑا تعجب اس وقت ہوتا ہے جبکہ اس قسم کے شبہات یا اعتراضات اُن ذی علم حضرات کی طرف سے بھی علم میں آتے ہیں جن کے متعلق خیال نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے مشائخ کا سلف سے جو طریق عمل اس بارہ میں (یعنی اطاعت الٰہی و انابت الی اللہ کے عہد و میثاق کے وقت "تجدید ایمان" اور "ادا شہادتین" کے بارہ میں) رہا ہے اس سے واقف نہ ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "القول الجمیل" میں "بیعت کا ماثور عن السلف طریقہ اور اس کے الفاظ بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"اخذ بیعت کے وقت "شیخ" پہلے خطبہ مسنونہ پڑھے (الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ الخ)

ثم یلقنہ الایمان الاجمالی فیقول	پھر اس کو ایمان اجمالی کی تلقین کرے اور یوں کہے
قل اٰمنت باللہ وبما جاء من عند	کہو! میں اللہ پر ایمان لایا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے
اللہ علی مراد اللہ، واٰمنت برسول اللہ	جو کچھ آیا ہے اس پر بھی اُس کی مراد کے مطابق
وبما جاء من عند رسول اللہ علی مراد	ایمان لایا، اور میں اللہ کے رسول پر ایمان لایا
رسول اللہ، وتبرأت من جمیع الادیان	اور رسول خدا کی طرف سے جو تعلیمات آئی ہیں
جمیع العصیان، واسلمت الان واقول	اُن پر بھی ایمان لایا مطابق اس کے جو رسول کی
اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان	مراد ہو۔ اور میں تمام دوسرے دینوں اور ہر قسم کی
محمداً عبدہ ورسولہ۔	نافرمانیوں سے بری اور بیزار ہوا اور اب میں نے اسلام کو اختیار
(شفاء العلیل صفحہ ۱۰)	کیا اور میں کہتا ہوں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان

محمداً عبدہ ورسولہ۔"

الغرض "جماعت اسلامی" میں داخلہ کے وقت جس کی حیثیت اسلامی مطالبوں کو پورا کرنے، ایمانی تقاضوں پر عمل کرنے اور خصوصاً اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ایک نظام کے ماتحت جد و جہد کرنے کے واسطے "عہد و میثاق" کی ہے۔ اور جو درحقیقت ایک قسم کی "بیعت" ہی ہے (تو اس عہد و میثاق اور اس بیعت کے وقت) "تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین" کا جو طریقہ جماعت کے دستور میں رکھا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کوئی "منکر" اور قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے، بلکہ بزرگانِ سلف کا مسلوک طریقہ بھی ہے جس کو ہمارے اُن مشائخ نے غالباً انہی مصالح کی وجہ سے اختیار کیا تھا جن کے پیشِ نظر ہم کو یہ اختیار کرنا پڑا ہے۔

— خیر یہ تو "جواب" تھا اور صحیح اور واقعی جواب — اس کے بعد میں آپ کو بتلاؤں کہ اب سے کئی مہینہ پہلے بعض تجربات کے بعد خود میں نے مولانا مودودی سے عرض کیا تھا کہ بعض اوقات ہمارے افہام و تفہیم کے باوجود لوگوں کو اس "ادائے شہادتین" کے متعلق یہ خلجان رہتا ہے کہ شاید ہم اپنی جماعت کے علاوہ دوسروں کو "مومن" نہیں سمجھتے اور اس لیے پہلے ہم کلمۂ شہادت پڑھوا کر تجدید ایمان کراتے ہیں، یا کم از کم یہ کہ ہم اپنے کو تمام دوسرے مسلمانوں سے زیادہ باایمان سمجھتے ہیں، اس لیے میری رائے ہے کہ اس کو شرطِ لازم نہ رکھا جائے بالخصوص جبکہ جماعت میں داخل ہونے والے شخص کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ بحمداللہ حقیقتِ ایمان سے وہ اچھی طرح باخبر اور اس کی ذمہ داریوں کو پوری طرح سمجھنے والا ہے۔ تو ایسی صورت میں مناسب ہے کہ ہم اس خواہ مخواہ کی "تہمت" اور غلط گمانی سے بچنے کے لیے "ادائے شہادتین" کے مطالبہ کا التزام نہ کیا کریں۔ تو مولانا نے میری اس گذارش کو مان لیا تھا، اور اب خود میرا طرزِ عمل بھی یہی ہے کہ جہاں مناسب سمجھتا ہوں ایسا ہی کرتا ہوں۔

الغرض "تجدید ایمان" یا "ادائے شہادتین" کے لفظوں کی بنیاد پر "جماعتِ اسلامی" یا مولانا مودودی کے متعلق اس قسم کے جو خیالات پکائے اور پھیلائے جاتے ہیں ہم سب بحمداللہ اُن سے بری ہیں۔ ان چیزوں سے ہماری جو غرض اور جو مقصد ہے وہ وہی ہے جو بار بار عرض کیا جا چکا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا مودودی کے بعض مضامین یا "دستور جماعت" میں آئے ہوئے لفظ "قومی سلمان" نسلی مسلمان" یا "مردم شماری کے مسلمان" سے بھی خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم دوسرے تمام مسلمانوں کو دینی مسلمان نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اصلیت اور حقیقت وہی ہے جو اوپر عرض کی جا چکی ہے کہ "ملت اسلامیہ" کے موجودہ اجتماع میں جو لوگ واقعی اللہ و رسول پر ایمان رکھتے ہیں اُن کو بحمداللہ ہم مومن ہی سمجھتے ہیں اور اُن میں سے بہت سوں کو تو اپنے سے بدرجہا اچھا مومن بھی جانتے ہیں، لیکن جو لوگ واقعتاً صرف نسل ہی کے اعتبار سے "مسلمان" ہیں اور بس اسی حیثیت سے مسلمان ہیں کہ وہ "مسلمان قوم" کے ایک فرد ہیں (جیسے کہ کتنے ہی ہندو، ہندو دھرم سے آزاد بلکہ بیزار تک ہونے کے باوجود صرف اس لیے "ہندو" ہیں کہ ہندو سوسائٹی کے ایک فرد ہیں) تو اُن کے لیے "نسلی مسلمان" اور "قومی مسلمان" یا "مردم شماری کے مسلمان" کے علاوہ، آخر اور کیا لفظ استعمال کیا جائے ؟ جو لوگ دین کے اساسی اصولوں تک سے بے بہرہ ہوں، بلکہ اُن میں سے بہت سے اُن سے منحرف بھی ہوں، اور جن کے نزدیک اللہ و رسول کے احکام کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، اور زندگی کی کسی منزل میں بھی وہ یہ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھتے ہوں کہ اللہ و رسول نے اس بارہ میں کیا ہدایت دی ہے، اور جن کے تمام مشاغل حیات گواہی دے رہے ہوں کہ وہ اپنے سامنے دنیا کی خوش عیشی کے سوا کوئی اور مقصد نہیں رکھتے (اور کون آنکھوں والا ہے جو اس سے انکار کر سکے کہ ہماری "مسلمان قوم" میں ایسے افراد لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں) تو اُن لوگوں کو اگر قومی مسلمان، نسلی مسلمان، یا مردم شماری کے مسلمان، نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے ؟ ایسوں کو دینی مسلمان اور واقعی مومن کہنا تو صرف جھوٹ اور خلاف واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام و ایمان پر سخت ترین ظلم اور دین کی تغییر بھی ہے۔

میرے یہ لفظ شاید آج کل کے "قومیت" کے شور و غوغے میں بہت ہی شاق گذریں گے لیکن میں پوری دیانتداری سے یہی سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہو جس سے ہم اُن "غیر مومن مسلمانوں"

کا نا مسلمان" ہونا خود اُن کو اور دُنیا کو تبلا سکیں تو یہ دین کی بہت بڑی خدمت ہو گی، اور "اسلام" اللہ کا دین" ہونے کے بجائے آج "ہندویت" کی طرح جو ایک قومی نائٹیل ہو کر رہ گیا ہے اور مسلمان "حزب اللہ" ہونے کے بجائے جو ایک قومی نقطہ نظر رکھنے والی قوم" ہو کر رہ گئے ہیں جس نے حقیقت کو بالکل ہی بدلدیا ہے اور اسلام و ایمان کی دعوت کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں، تو ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ اسی طرح ہو سکے گا۔ مجھے آپ کے اس خیال سے قطعی اختلاف ہے کہ موجودہ مسلمان "قوم" کو ایک قوم" بنانے والی چیز اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول کے پیغام سے وابستگی ہے۔ واقعتاً ایسا ہوتا تو ہماری اس قومیت کے دائرے میں اُن لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی جو اللہ کی اس ہدایت اور اس کے رسول کے اس پیغام سے عملاً کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس قوم کے فرد مانے جاتے ہیں بلکہ ان کی یہ حالت قومی سرداری کے منافی بھی نہیں سمجھی جاتی اور کتنے ہی ہیں جو ایسے ہونے کے باوجود قوم کے لیڈر بھی ہیں۔

دیکھیے غلط فہمی نہ ہو میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ ساری قوم ہی ایسی ہے۔ بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ "قوم" میں ایسے بھی موجود ہیں، حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان وجہ جامع اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ بھی مسلمان نسل کے ہیں، اور مسلمان قوم کے فرد ہیں، اور "سرکار" میں ان کا مذہب مسلمان لکھا جاتا ہے اور صرف انہی وجوہ سے وہ سیاسی پلیٹ فارم" پر مسلمانوں کے لیڈر" اور کونسلوں اسمبلیوں میں مسلمانوں کے نمائندے" ہیں۔ تو اس "ذرہ ذرہ مسلم قومیت" کے متعلق میں ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بنیاد اللہ و رسول نے رکھی ہے۔

میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا کوئی خاص تعلق "جماعت اسلامی" کے معاملہ سے نہیں ہے بلکہ جب سے مجھے کچھ دینی شعور حاصل ہوا ہے اسی وقت سے میرے خیالات اور میری فکر کا یہ مرکزی نقطہ رہا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ کسی بھی ایسے شخص کی رائے

اس سے مختلف نہ ہوگی جو دین اور اس کے مقتضیات کا بھی صحیح علم رکھتا ہو اور موجودہ "مسلمان قوم" کی حالت بھی اس کے علم میں ہو۔ آپ کے متعلق مجھے گمان ہوتا ہے کہ شاید آپ ہمیشہ کسی اچھے اور ایمانی ماحول ہی میں رہے ہیں اور اس لیے آپ نے "مسلمانوں" میں صرف "مسلمان" ہی دیکھے ہیں۔

بہرحال میں اس معاملہ میں اپنے دماغ میں کوئی الجھن اور کوئی شک و شبہ نہیں رکھتا کہ آج کل کی "مسلمان قومیت" اور "اصل اسلامیت" بالکل الگ کی دو چیزیں ہیں اور ان دونوں کے فرق کو صاف کر کے اصل اسلامیت کا تعارف کرانا ہمارا اہم دینی فریضہ ہے۔ لیکن اس اجمالی اور اصولی تصور کے باوجود ملت کے عام افراد و اشخاص کے ساتھ (جن کے متعلق ہم کو متعین طور سے معلوم نہیں ہے کہ وہ ایمان کے ادنیٰ درجہ سے بھی خدانخواستہ خالی ہیں) ہمارا برتاؤ مسلمانوں ہی کا سا رہے گا۔ ہم اُن کو اخوانِ ملت ہی سمجھتے ہیں اور سمجھیں گے۔

نیز عام مسلمانوں کے لیے ہماری دعوت الی اللہ بھی ان کو نسیان زدہ اور سبق بھلا دینے والی اُمت سمجھ کر ہی ہے اور ہوگی، نہ کہ کھلے غیر مسلموں کی طرح ان کو "منکرین اسلام" قرار دے کر، اور ان دونوں پوزیشنوں میں جو فرق ہے وہ یقیناً آپ سے مخفی نہ ہوگا۔

(ل) آپ نے لکھا ہے کہ مولانا مودودی کی جن تالیفات کو "جماعت کا لٹریچر" کہا جاتا ہے اُن میں کچھ باتیں غلط اور خلافِ صواب بھی موجود ہیں۔ اور اُن کی ایک مثال بھی آپ نے "الجہاد" سے پیش کی ہے۔

میرے محترم! الجہاد تو مولانا مودودی کی اب سے کوئی پندرہ برس پہلے کی تصنیف ہے (جبکہ اللہ کے سوا شاید کسی کے بھی علم میں نہ ہوگا کہ ۱۳۶۰ھ میں "جماعت اسلامی" بنے گی اور مولانا اس کے لیڈر ہوں گے) لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ انھوں نے جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد یا اس سے کچھ پہلے بھی جو کچھ لکھا ہے (جس کا جماعتِ اسلامی سے بہت قریبی تعلق ہے) ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سب بھی ہمارے نزدیک صحیح و صواب ہی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو انھوں نے صحیح سمجھ کر لکھا ہو اور

ہمارے نزدیک وہ صحیح نہ ہو میں نے "الجہاد فی الاسلام" کو اور اسی طرح مولانا مودودی کی اکثر تالیفات کو بالاستیعاب آج تک نہیں دیکھا ہے۔ ہاں جستہ جستہ نظر قریب قریب سب ہی چیزوں پر پڑی ہے اُن کے مضامین کے جو مجموعے اب کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اُن کے اکثر مضامین بھی کبھی ترجمان القرآن ہی میں پڑھ لیے ہیں۔ مجھے ان چیزوں میں متعدد مقامات ایسے یاد ہیں جہاں میں اُن کی تحقیق اور ان کی فکر کو اپنی دانست میں صحیح نہیں سمجھتا مثال کے طور پر سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ایک عام استفتا کے جواب میں نفس مسئلہ مسئولہ عنہا کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے میں فقہی حیثیت سے اسے صحیح نہیں سمجھتا، بلکہ اس باب میں اُس رائے کو صحیح سمجھتا ہوں جو دوسرے علماء نے اختیار کی ہے (اور خود مودودی صاحب نے بھی "حقوق الزوجین" میں اپنی "اصلاحی تجاویز" کی بنیاد اُس پر رکھی ہے اور موجودہ وقت میں اُس کو "حد جواز" میں لکھا ہے)۔ البتہ میں اُن کی "جواب استفتا" والی تحریر کی بھی اس لحاظ سے قدر کرتا ہوں کہ وہ "اسلامی نصب العین" کو یاد دلاتی اور ہم کو توجہ دلاتی ہے کہ غیر الٰہی نظام کے تسلط کے وقت میں محض عارضی طور پر اور بدرجۂ مجبوری ہی حد جواز کے اس طریقہ کو ہم اختیار کر سکتے ہیں اور ہمارا اصل فرض اس مجبوری کی لعنت ہی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرنا ہے۔

علیٰ ہذا "دین کی چار بنیادی اصطلاحوں" کے عنوان سے "ترجمان" میں جو مضمون ان کا نکل رہا ہے جس کا نسبتہً جماعت سے بہت قریبی تعلق ہے، اس کے اصلی مقصد و مدعا سے متفق ہونے کے باوجود اس کے بعض حصوں سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہے۔

اور یہ تو میں نے صرف مثالاً ایک دو چیزیں لکھ دی ہیں ورنہ ان کی تحریروں میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے مجھے اختلاف ہے۔ لیکن اس قسم کے اختلاف آراء سے اس قسم کی کوئی جماعت بھی نہیں بچ سکتی۔ بایں ہمہ ایک عام خیال ان کی تحریرات کے متعلق میرا یہی ہے کہ ان کا بہاؤ پورے زور کے ساتھ اسلامیت اور خدا پرستی کی طرف کو ہوتا ہے۔ اور ان کا مطالعہ ایمان میں بصیرت اور

حرارت ہی کا اضافہ کرتا ہے۔ بالخصوص "جماعتِ اسلامی" کا جو مقصد و نصب العین ہے اور اس کے پیشِ نظر جو کام ہیں ان کو سمجھنے اور اپنا مقصدِ حیات بنا لینے کی طرف مولانا مودودی کی بیشتر تحریرات اچھی ہی رہنمائی کرتی ہیں اور بس اسی لحاظ سے وہ "جماعتِ اسلامی" کا لٹریچر ہیں نہ یہ کہ اُن میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ تمام رفقاءِ جماعت کے نزدیک جزءاً جزءاً صحیح اور مسلّم ہے۔

شاید آپ نے غور نہیں فرمایا پہلے اجتماع کی روداد میں مولانا مودودی صاحب کی طرف سے نہایت صفائی کے ساتھ یہ بات ظاہر کردی گئی ہے کہ فقہی یا کلامی مسائل میں اُن کا جو طریقۂ فکر اور جو نتائجِ تفکر ہیں، رفقائے جماعت کا اُس سے موافقت کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہی تو ہوا کہ "ہم جماعتِ اسلامی" میں منسلک ہونے کے باوجود اُن کی تحقیقات سے اختلاف رکھ سکتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہم اُسی چیز سے اختلاف کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح نہ ہوگی۔ تو اگر انھوں نے "الجہاد فی الاسلام" یا اپنی دوسری کتابوں میں کچھ ایسی باتیں لکھی ہوں جو ہمارے یا آپ کے نزدیک صحیح نہ ہوں تو ہم پر یا آپ پر یا "جماعتِ اسلامی" پر اس کا کیا اثر؟ ایسے مواقع پر ہمارا کام یہی ہے کہ ہمارے نزدیک جو چیز صحیح ہے ہم اُس کو ان تک پہنچا دیں اور اُن کی غلطی پر ان کو مطلع کرکے اصلاح و تصحیح کی طرف ان کو توجہ دلائیں (بشرطیکہ ان کی بات کا غلط اور ناصواب ہونا ہمارے نزدیک متعین ہو) اور اگر اس کے بعد بھی وہ اپنی ہی رائے پر قائم رہیں اور اپنی غلطی محسوس نہ کریں، اور ہماری نظر میں وہ غلطی دیانتداری کے ساتھ "منکر" درجہ کی ہو (یعنی اجتہادی قسم کی چیز نہ ہو جس میں اختلاف اور تعددِ آراء کی گنجائش ہوتی ہے) تو زیادہ سے زیادہ ہمارے ذمہ بس اتنا ہے کہ اپنے اختلاف اور نکیر کو ظاہر کردیں۔ اور اگر خدانخواستہ امیرِ جماعت سے (خواہ مولانا مودودی ہوں یا کوئی اور) کوئی غلطی ایسی ہو جو حدِ ضلال" تک پہنچتی ہو تو پھر اس سے رجوع کرنے کا اور اس پر اصرار کرنے کی صورت میں اُس سے "انعزال" کا یا "جماعت" سے معزول کردینے کا ہم مطالبہ کرسکتے ہیں ـــ لیکن "الجہاد فی الاسلام" کی جس غلطی کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے وہ بس ایک علمی غلطی کہی جاسکتی

ہے۔ اس سے زیادہ میرے خیال میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اور اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ایسا شخص کیوں جماعت کا امیر اور لیڈر رہے جو ایسی غلطیاں کر سکتا ہو تو گزارش یہ ہے کہ وہ کون مصنف ہے جس کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات میں ناقدوں نے دو چار غلطیاں بھی نہ نکال دی ہوں یا نہ نکال سکتے ہوں۔ میرے بہت سے علمی بزرگ ہیں جن کے علمی تبحر اور تفقہ فی الدین کا میں پوری طرح معترف ہوں، اُن کو عہدِ حاضر کے "علماء راسخین" میں سے سمجھتا ہوں اور خاص جہات میں ان کی طرف رجوع بھی کرتا ہوں، باایں ہمہ اُن کی بعض علمی تحقیقات کو میں صحیح نہیں سمجھتا حالانکہ جانتا ہوں کہ میں خود ان کے تلامذہ اور خدام کی آخری صف میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں ہوں۔ بہرحال اگر مولانا مودودی کی تحریرات میں ایسی بہت سی غلطیاں بھی موجود ہوں تو "جماعت اسلامی" پر اُن کا کوئی اثر نہیں۔ اور نہ ہم نے یہ سمجھ کر ان کو جماعت کا امیر چنا ہے کہ وہ خود یا اُن کا علم و فکر "محفوظ عن الخطا" ہے۔ تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا ان غلطیوں سے ان کو آگاہ کر کے ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلانا ہمارا ایک نیک کام ہوگا، اور اس نیکی کے لیے مودودی صاحب یا رفقاءِ جماعت ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر مسلمان کا ہم پر حق ہے کہ اگر ہم اس کو کسی ایسی غلطی میں مبتلا دیکھیں تو اُن کو اس سے نکالنے کی کوشش کریں اور علیٰ ہذا اگر ہم سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے تو وہ ہم کو اس پر تنبیہ کر دے۔ البتہ مولانا مودودی اور ہم آپ چونکہ ایک راہ کے رفیق ہیں، اور ہمارا ایک خاص دینی رشتہ بھی ہے اس لیے ہم پر ایک دوسرے کی "نصیحت" اور "تعاون علی البر والتقویٰ" کی ذمہ داری دوگونہ ہے۔

الدین النصیحۃ للہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔

الصّوم

(از جناب مولانا - سید محمد جعفر صاحب پھلواروی)

یہ پوری کائنات ایک باقاعدہ و منظم سلطنت ہے۔ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر واقعہ یوں ہی ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم ایک مربوط سلسلہ ہے۔ اس کی مربوطیت اور باقاعدگی خود بتاتی ہے کہ اس پورے نظام سلطنت کو ایک ہی فرمانروا بغیر کسی مدد کے چلا رہا ہے اور انسان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اسی مالک الملک کی ایک ادنیٰ رعیت ہے اور اس کی خیر اسی میں ہے کہ وہ اس احکم الحاکمین کی وفادار و فرمانبردار رعایا بن کر رہے ۔۔۔ اسلامی نظام زندگی کا بنیادی تصور یہی ہے۔ اور انسانوں سے اس کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے مومن و مسلم (وفادار و فرمانبردار) بن کر رہیں۔

یہ مطالبہ بالکل صحیح اور حق بجانب ہے۔ انسان نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا ہے اور اس لیے یقیناً وہ اپنی اُن قوتوں کا بھی خود خالق نہیں جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ پس یہ قوتیں جہاں سے آئی ہیں وہی ان کا خالق اور مالک ہے اور انسان اُن کا فقط امانتدار ہے۔ اور امانتدار کا فرض یہ ہے کہ وہ امانت کو اس کے مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، ورنہ وہ امین نہیں ہوتا خائن قرار پاتا ہے اور جس نوع کی خیانت ہوتی ہے اسی نوع کی سزا بھی دیجاتی ہے۔ اور جس درجہ کی امانتداری ہو ویسا ہی انعام ملتا ہے۔

اپنی ہر قوت کے استعمال میں انسان ایک ہی وقت میں مجبور بھی ہے اور قادر بھی، مقید بھی ہے آزاد بھی۔

وہ آنکھ سے دیکھنے ہی پر مجبور ہے، کانوں سے بول نہیں سکتا، ناک سے سننے پر قادر نہیں، ہاتھوں میں ذائقہ لانے سے عاجز ہے، زبان سے دید و شنید محال ہے۔ وہ مجبور ہے کہ چار و ناچار اپنی ہر قوت سے وہی کام لے جس کے لیے واضعِ قدرت نے اُسے وضع کیا ہے یعنی لامسہ سے چھوئے، ذائقہ سے چکھے، شامہ

سے سُننے وغیرہ تو جہاں۔ غرض اس کی ہر قوت مجبور ہے کہ اسی قانون پر چلے جو انسان سے مشورہ کیے بغیر اور ان قوتوں سے ووٹ لیے بغیر مقنن فطرت نے بنا دیا ہے۔

اسی طرح انسان اس پر بھی مجبور ہے کہ اپنے پھیپھڑے سے کام لیتا رہے اور تنفس کا سلسلہ لاانتہا ہی قائم رکھے، معدہ خالی ہو تو کھانا کھائے، حلق خشک ہو تو پانی پیے، ولولۂ شباب سے مغلوب ہو تو وسائل نسلیہ کی جستجو کرے ۔۔۔

آپ نے دیکھا انسان سر سے پاؤں تک کتنا مجبور، کیسا بے بس اور کس قدر بے اختیار واقعہ ہوا ہے؟ ان مجبوریوں میں ایک بھی تو ایسی نہیں جس کا مقابلہ کر کے انسان اپنی ہستی کو باقی رکھ سکے، ایک قانون بھی تو ان قوانین کون و فطرت میں ایسا نہیں جسے توڑ کر انسان بقاء وجود کا لفظ بھی زبان پر لا سکے۔ لیکن اسی انسان کی جامع الاضداد ذات ملاحظہ ہو، ایک طرف تو یہ بے بسی و بے اختیاری اور یہ عاجزی و مجبوری ہے اور دوسری طرف اختیارات کا سمندر اس کے کوزے میں سمویا ہوا ہے، قدرتوں کی لامحدود دنیا اس کی مٹھی میں ہے اور اس کی خود مختاری کا طول و عرض ناقابلِ پیمائش ہے۔ بے بسی یہ ہے کہ وہ آنکھوں سے صرف بصارت کا کام لے سکتا ہے ان سے چکھ نہیں سکتا، سونگھ نہیں سکتا، بول نہیں سکتا، سُن نہیں سکتا۔ کیسی بیکسی اور کس درجہ مجبوری ہے لیکن ساتھ ہی اس کی ہمہ گیری و وسعت کو دیکھو کہ پوری کائنات ذرا سی مردمک (پتلی) میں سمائی ہوئی ہے۔ اختیارات کی لامحدودیت ملاحظہ ہو، جو کچھ چاہے دیکھ سکتا ہے جب چاہے دیکھ سکتا ہے جتنی بار چاہے دیکھ سکتا ہے جتنی دور چاہے دیکھ سکتا ہے۔ اور آج اس کی قوتِ باصرہ کی اختیاری قوت کو تم دیکھ رہے ہو کہ کرۂ ماہ کو ۲ لاکھ میل سے کھینچ کر صرف زمین پر لے آئی ہے۔ اس چھوٹی سی مردمک میں قدرت و اختیار کی کتنی وسیع دنیا سموئی ہوئی ہے کہ وہ جس شے کو چاہے دیکھے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ ورقِ قرآن کو دیکھے یا اس پر عمل کرے کہ ؎

بر مصحفِ روئے او نظر کن خسرو غزل و کتاب تا کے؟

وہ چاہے تو پوری کائنات کو دیدۂ اعتبار سے دیکھے اور چاہے تو اپنا سارا وقت تصاویرِ عریاں کا البم دیکھنے میں صرف کر دے

وہ خواہش کرے تو دوست کو بغض و کینہ کی نظر سے دیکھے اور خواہش ہو تو دشمن پر محبت کی نظر ڈالے۔ وہ ارادہ کرے تو ہر شئے کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھے ورنہ رنگین عینک چڑھا کر ساری کائنات کو جعلی رنگ سے رنگدے۔ بغرض ایک مجموعۂ بے اختیار مردمکِ چشم میں قدرت و اختیار کی لامحدود دنیا پنہاں ہے۔ اور یہی حال اس کی تمام قوتوں کا ہے۔ ہر قوت کے استعمال میں وہ یہاں تک مجبور ہے کہ وہ اس سے وہی کام لے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ یعنی اس کے لیے جو قانون اس قوت کے بخشنے والے نے بنا دیا ہے وہ اس سے سرمو تجاوز نہ کر سکے۔ اسی کو قانونِ فطرت یا امرِ تکوینی کہتے ہیں جس کی اطاعت چار و ناچار، بہ ارادہ و بلا ارادہ، طوعاً و کرہاً ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس قید و بند کے ساتھ ہر قوت کے استعمال میں انسان آزاد و مختار بھی ہے کہ وہ اسے جہاں چاہے کام میں لائے اسراف کے ساتھ یا اعتدال کے ساتھ، برمحل یا بے محل، بارادۂ خود یا بحکمِ غیر، صحیح یا غلط، ذمہ داری کے ساتھ یا بغیر کسی ذمہ داری کے، بخوشی یا بجبر، چند بار یا لگاتار، باخلاصِ نیت یا بدونِ خلوص۔ یہیں سے دنیا کے انسان دو گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے بے اختیار حصہ میں تو مومن و کافر سب یکساں ہیں لیکن جتنا حصہ اختیاری ہے اس میں ایک تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ہر قوت کے استعمال میں اپنے آپ کو آزادی دے رکھی ہے اور اگر اسے پابند کیا ہے تو بخشندۂ قوت کی مرضی سے نہیں بلکہ کسی اور کے خیال سے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اپنی قوتوں کے اختیاری حصے کو بھی اسی کا پابند بنا دیا ہے جس کا پابند وہ اپنے غیر اختیاری حصۂ زندگی میں ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی قوتوں کو نہ اپنی پیدا کردہ سمجھتے ہیں نہ اپنی ملک۔ وہ انھیں اللہ کی دی ہوئی امانتیں یقین کرتے ہیں اور وہیں استعمال کرتے ہیں جہاں مالک کا حکم یا اجازت ہو۔

اللہ اپنے بندوں سے یہی چاہتا ہے کہ جس طرح تمھاری تمام قوتیں بے اختیار میرے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کے آگے سجدہ ریز ہیں اسی طرح وہ اپنے اختیاری حصے میں بھی میرے قوانینِ ہدایت کے آگے جھکی رہیں تاکہ تم بے اختیاری میں بھی میرے ہی بندے بنے رہو اور اپنے اختیار و پسند سے بھی میرے ہی غلام ہو کر رہو۔ آنکھیں مجبور ہیں کہ بصارت کے سوا اور کوئی کام نہ دے سکیں اور جو قانونِ حس اس کے لیے بنایا گیا ہے اسی کی پابند ہو کر رہیں۔ لیکن بصارت کی

آزادی و اختیار کو بھی خدا ہی کے قانونِ ہدایت کے مطابق کر دینا آنکھوں کی خدا بندگی و غلامی ہے یعنی آنکھوں سے صرف وہ دیکھا جائے جس کے دیکھنے کا آنکھیں بخشنے والا روادار ہو اور وہاں سے نظر ہٹالی جائے جہاں نظر جمانا اس مالک کی مرضی کے خلاف ہو۔ کانوں سے وہی سنا جائے جس کے سننے کی اجازت مالک نے دی ہو۔ زبان سے وہی چکھا یا بولا جائے جس کے چکھنے یا بولنے کے لیے مولا کے حکم میں کوئی گنجائش موجود ہو۔ غرض اپنی ساری قوتوں کو اس آقائے یکتا کی مرضی کے مطابق بنا لیا جائے حتیٰ کہ دل اور دماغ سے صرف وہی باتیں سوچی جائیں جن کے لیے مالک کا قانون کوئی روک نہ پیدا کرتا ہو۔ اپنے کھانے کو اسی کے حکم کا تابع کر دے۔ اپنے مشرب کو اسی کے قانون کا مطیع کر دے اور اپنے حیوانی عنصر کی تسکین کو اسی کی ہدایت کے ماتحت رکھے — صوم اسی حقیقت کا بلکہ اس حقیقت کی مشق کا دوسرا نام ہے۔

صوم کا مقصد صرف "مفطراتِ ثلٰث" (کھانا، پینا اور قربتِ زوج) کے باب میں ہی اطاعتِ قانون کرانا نہیں بلکہ زندگی کے تمام مسائل میں قانونِ الٰہی کی اطاعت — اطاعت کی روح — پیدا کرنے کی مشق کرانا ہے۔ مفطراتِ ثلٰث تو دراصل شہواتِ نفس یعنی دلی خواہشوں کے تین اہم شعبے ہیں۔ ایسے اہم شعبے کہ ان ہی کی خاطر انسان وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جو اُسے نہ کرنا چاہیے۔ ان تین پر قابو پانے کے معنی اس مرکزی نقطے اور اُس اصل جامع کو قابو میں لانے کے ہیں جس سے یہ تین اہم شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اور جن کی معاونت میں سرکشی و بغاوت کے تمام شعوب خود بخود شریک ہو جاتے ہیں۔ چور اپنی چوری کو، ڈاکو اپنے ڈاکے کو، رشوت خوار اپنی رشوت کو، خائن اپنی خیانت کو اور ظالم اپنے ظلم کو یقیناً حق نہیں سمجھتے لیکن اپنے اپنے کام سب کیے جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ شکم سے مجبور بلکہ شکم کے غلام ہیں۔ قومِ طالوت نے باوجود نہی پیغمبری کے نہر مبتلا بہ کا پانی پی لیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پیاس نے نافرمانی پر مجبور کر دیا۔ ہاروت ماروت (اگر روایت کی نوعیت صحیح تسلیم کر لی جائے) چاہِ بابل میں معکوس معلق ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اپنے حیوانی عنصر پر قابو نہ پا سکے۔ اسی جذبہ حیوانی کی تسکین کی خاطر بھائی نے بھائی کو، باپ نے بیٹے کو، عاشق نے رقیب کو اور فرمانرواؤں نے فرمانرواؤں کو تہ تیغ کیا۔ خوب غور سے دیکھ جاؤ، دنیا میں تمام فسادات کی تہ میں یہی تین چیزیں کار فرما نظر آئیں گی اور ان تینوں کا مرکز صرف ایک ہے یعنی خواہشِ نفس کی الوہیت و فرمانروائی اور انسان کا اس کی بندگی اختیار کر لینا اَرَأَیْتَ مَنِ

اَتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ پس اس جھوٹے الٰہ کو زیر کر لینے کے معنی اس دارالسلطنت پر قابو پا لینے کے ہیں جہاں سے تمام فتن و فساد کا نفاذ ہوتا ہے۔

یہ واضح ہے کہ اخلاقی نظام کی تعمیر صرف قانون سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ صرف قانون سے کچھ دیر کے لیے ممکن ہے کوئی اخلاقی تعمیر ہو جائے لیکن جلد ہی اس کا نتیجہ فساد ہوگا۔ قانون کی اطاعت وہاں ہو سکتی ہے جہاں مقنن سے کوئی دنیوی امید یا خوف ہو لیکن جہاں ان دونوں کا فقدان ہو وہاں کونسی چیز انسان سے اطاعت قانون کرا سکتی ہے؟ اور وہ کونسا فرد یا جماعت ہے جس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت میں اس مقنن کا خوف یا امید ہر لحظہ مسلط ہو؟ دل میں بھی اور ظاہر بھی، خلوت میں بھی جلوت میں بھی، نور میں بھی ظلمت میں بھی، آبادی میں بھی ویرانے میں بھی، شہادت میں بھی غیب میں بھی، زندگی میں بھی مرنے پر بھی؟ اور وہ کونسا مقنن ہے جس کے متعلق ایک منٹ کے لیے بھی یہ باور ہو سکے کہ وہ خود بے غرض اور صمد ہے، ہر انسان کا یکساں خیر خواہ ہے، لغزشوں سے پاک و سبوح و قدوس ہے اور کل اپنی اغراض سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی تبدیلی کلمات و قانون نہ کر دے گا جس سے ہمارا آج کا فائدہ کل کے نقصان سے بدل جائے؟ ۔ پس انسانوں کی سلامتی، عالم کا امن، اخلاق کی تعمیر اور فساد کا فقدان صرف اسی پر موقوف ہے کہ انسان اپنے حقِ قانون سازی سے دستبردار ہو جائے اور یہ حقِ تقنین صرف اس الٰہ واحد کے لیے مخصوص سمجھے جو مذکورہ تمام انسانی کمزوریوں سے مُبرّا اور پاک ہو۔

اس حقیقت کا یورپ کو بھی عملاً اعتراف ہے۔ بعض یورپی ممالک نے یہ اصول بنایا ہے کہ (King never errs) بادشاہ لغزشوں سے پاک ہے یعنی سبوح و قدوس ہے۔ اس اصول کی غلطی اتنی ہی واضح ہے جتنی خود اصول بنانے والوں کی۔ بایں ہمہ ان کو اپنے استحکام کے لیے کسی خدا ہی کو جھوٹا سچا واسطہ بنانا پڑتا ہے۔ خود تاجدار برطانیہ کی تخت نشینی کے وقت پوپ یوں اقرار کر لیتا ہے کہ "کہو کہ بادشاہت مسیح کی ہے ہماری نہیں . . . ." مجالس قانون ساز کے ممبروں سے خدا ہی کو واسطہ بنا کر حلفِ وفاداری لیا جاتا ہے۔ عدالتوں میں خدا اور مذہب ہی کا واسطہ دلا کر بیان لیا جاتا ہے۔ فوجی سپاہی سے بھی بواسطہ خدا ہی اقرارِ اطاعت کرایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وائسرائے سے ساحلِ ہند پر قدم رکھنے سے پہلے ہی بائبل ہاتھ میں دے کر وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے ۔ یعنی دل میں سب یہی سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی مافوق طاقت کا

واسطہ: ہواس وفاداری کا کوئی یقین نہیں ہو سکتا۔ اور قانون کی اطاعت کسی ایسی ہستی کی مدد کے بغیر نہیں کرائی جاسکتی جو انسانی کمزوریوں سے پاک تسلیم کی جاتی ہو۔

اگر طولِ بے محل کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم بتاتے کہ اس صحیح واسطہ کا طریقِ استعمال کتنا غلط رکھا گیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واسطہ فقدانِ واسطہ سے زیادہ مضر ثابت ہوا ہے۔ بہرکیف یہ مسلّم ہے کہ اطاعتِ قانون کے لیے خود مقنن کے ساتھ خوف و امید کا غیر فانی تعلق ضروری ہے۔ لیکن یہ عجیب بے جوڑ اور لایعنی منطق ہے کہ قانون ہو انسان کا اور خوف و رجا ہو اللہ سے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قانون ہو خدا کا اور خوف و رجا کا تعلق ہو انسان سے۔ خدا جس چیز کا مطالبہ اپنے بندوں سے کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ میرے ہی قانون کی اطاعت کرو اور مجھ ہی سے خوف و امید رکھو۔

قانون خواہ الٰہی ہو یا انسانی، ظاہر میں دونوں ہی قانون ہیں اور دونوں ہی ممکن العصیان ہیں۔ جو بندوں کے قانون کو توڑ سکتا ہے وہ خدا کے قانون سے بھی بغاوت کر سکتا ہے۔ قانونی بغاوت و نافرمانی سے روکنے والی چیز خود قانون نہیں بلکہ قانون کی وہ روح ہے جو ہر لحظہ انسان کی روح میں ساری و جاری اور اس کے قلب و دماغ پر قابض و مسلط ہو۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے مجموعۂ خوف و رجا اور مختصر لفظوں میں تقوی اللہ کہتے ہیں۔ قانون خود اپنی اطاعت نہیں کراتا بلکہ تقویٰ کراتا ہے۔ تقویٰ کا سارا تعلق قلب و روح سے ہے اور قانون کی گرفت روح و قلب پر نہیں ہوتی — صوم اسی کیفیتِ تقویٰ کو پیدا کرنے کی ایک مشق ہے۔ اور یہ طرفہ تماشا صرف اس خدائی قانون میں ہے کہ یہ نرا قانون ہی نہیں بلکہ روحِ قانون بھی ساتھ ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس میں فقط قانونِ صوم کی اطاعت ہی مطلوب نہیں بلکہ مطلق قانون کی روح یعنی تقوی اللہ کی تدریب و مشق اور تمرین و تعلیم بھی ہے۔ اور اسی مقصد کو دو لفظوں میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ یہی وہ روح ہے جو بسیط ہو کر انسان کو ہر ہر قدم پر تمام شعبۂ زندگی میں قانونِ الٰہی کا پابند بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ تقویٰ اور یہ روحِ قانون اگر نہ ہو تو سارے قوانینِ الٰہی بھی قابلِ شکست اور ممکن المعصیت قوانین بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں اور انسانی قوانین میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا اور صوم ہوتا بھی ہے تو "رت" سے کوئی ممتاز عبادت نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سارا زور اسی تقوی اللہ پر صرف کیا گیا ہے۔ ہر قانون

کے ساتھ ساتھ تقویٰ پر زور ہے، تمام قصص میں جگہ جگہ تقویٰ کی طرف عطفِ توجہ ہے، سارے اوامر و نواہی تقویٰ کے ذکر سے پُر ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی الٰہی قانون بھی اپنی اصلی اسپرٹ کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا اور کسی اخلاقی نظام کی تعمیر اس بنیاد کے بغیر ناممکن ہے۔ امریکہ کے قانونِ نشہ بندی کا حشر آپ دیکھ چکے ہیں۔

اب اسی نقطۂ نظر سے صوم کو دیکھو۔ صائم شب کو اٹھتا ہے اور سحری کھانی شروع کرتا ہے۔ ابھی آدھی سحری کھائی تھی کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وقت ختم ہوگیا اور وہ وہیں اپنے لذیذ کھانے کو چھوڑ دیتا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے سامنے شدید بھوک کی حالت میں اچھے سے اچھا کھانا میسر آتا ہے اور وہ نہیں کھاتا۔ شدت کی پیاس ہوتی ہے اور ٹھنڈے پانی کا گھڑا یا شربت کا پیالہ سامنے ہوتا ہے اور وہ منہ نہیں لگاتا۔ مہینوں کے سفر کے بعد گھر واپس آتا ہے اور رفیقۂ حیات پہلو میں ہوتی ہے پھر بھی وہ متوجہ نہیں ہوتا — یہ سارے مواقع اسے ایسی حالت میں ملتے ہیں کہ اسے کوئی دیکھنے والا، کوئی بدنامی کا خوف، کسی منفعت کا لالچ اور کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ہوتا، لیکن وہ ساری نعمتیں جو اس کے لیے شب کو حلال ہیں، دن کو اپنے اوپر خود اپنی خوشی سے حرام کر لیتا ہے۔ وہ کل تک روزے کو فرض سمجھتا تھا اور آج عید کے دن اسے حرام یقین کر لیتا ہے۔ قانون شکنی سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہاں صرف ایک جذبہ، ایک روح اور ایک کیفیتِ خاص ہوتی ہے جو اسے قانونِ الٰہی کی بغاوت سے روک دیتی ہے اور اسی کا نام تقویٰ اللہ ہے۔ وہ قانونِ صوم کے مقنن سے خوفِ عذاب اور رجاءِ ثواب اس لیے رکھتا ہے کہ وہ اسے حاضر و ناظر جانتا ہے، حی و قیوم سمجھتا ہے، اور اس کی سبوحیت و قدوسیت پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر اس کا یہ تقویٰ بالکل غیر شعوری نہ ہو تو ہر جگہ اطاعتِ قانونِ الٰہی میں روح کی طرح کام کرتا ہے۔ اور اگر واقعتاً وہ "صائم سائح" ہے تو اس کے کردار کی بلندی دماغ انسانی کی پرواز سے بھی پرے ہوتی ہے

جب اس نوعیت کا تقویٰ پیدا ہوتا ہے تب اسی بنیاد پر وہ نظامِ زندگی تعمیر ہوتا ہے جسے انجیلی زبان میں "خدا کی بادشاہت" اور قرآنی اصطلاح میں "دین اللہ" کہتے ہیں۔ خدا اپنے بندوں سے محض ایک نظامِ سیاست کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اپنے دین کی اقامت چاہتا ہے۔ دین اُس ہمہ گیر نظام کو کہتے ہیں جس کا ضابطہ زندگی کے ہر شعبہ پر یکساں حاوی ہو۔ انفراد سے لے کے اجتماع تک ہر نظام اسی کے سانچے میں ڈھلا ہو، اسی کا نظامِ اخلاق، اسی کا نظامِ سیاست، اسی کا نظامِ تمدن،

اسی کا نظام معیشت اور اسی کے سارے نظامات ہوں حتیٰ کہ طرزِ فکر اور نظریہ ترک و اختیار اور معیارِ پسند و ناپسند سب کے سب اسی ہمہ گیر قانون کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ یہ دین وہی افراد قائم کر سکتے ہیں جن کے اندر نظامِ اطاعت کی وہ روح موجود ہو جو صوم سے مطلوب ہے۔ اس کے دو جز ہیں جو باہم مل کر ایک نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہے ہر غیر اللہ کی غلامی سے نکل جانا۔ دوسرا ہے ہر غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجانا۔ اب دیکھو روزہ کس طرح ان دونوں مقصدوں پر حاوی ہے۔

انسان یا تو دوسروں کے حکم کا بندہ ہوتا ہے یا اپنی خواہش کا۔ غیر اللہ دونوں ہیں۔ اگر دوسرے حکم چلانے والے وہ ہیں جو صرف اللہ کا حکم چلاتے ہیں جب تو وہ عین اللہ کی اطاعت و بندگی ہے لیکن اگر وہ اپنا حکم یا قانون یا فیصلہ منواتے ہیں تو سراسر طاغوت ہیں۔ مثلاً حکومت کافرہ، یا اس سے کم وسعت کے ساتھ برادری۔ ان دونوں کے احکام و قوانین اور فیصلوں سے الگ رہنا نسبتاً سہل ہے۔ ایک حکومت کے حدود میں رہ کر کسی پہاڑ پر زندگی بسر کیجیے یا جنگل میں قیام اختیار کر لیجیے۔ بہت حد تک اور ممکن ہے ساری عمر دونوں کی زد سے آپ بچ جائیں گے۔ آپ کو ان کے قوانین پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی یا آئے گی تو بہت کم آئے گی۔ اور اگر آپ حدودِ مملکت یا حدودِ برادری سے ہی باہر ہو جائیں تو اور بھی آزاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن جس کی غلامی سے آزادی حاصل ہونا سخت دشوار ہے وہ ہے اپنا نفس۔ جہاں اور جس حال میں بھی کوئی ہوگا اس کا نفس اور نفس کی خواہشیں ساتھ ہوں گی اور اپنے حکم کی تعمیل کراتی رہیں گی۔ اس لیے خدا سب سے پہلے جس شے کی بندگی و غلامی و بندگی واطاعت سے انسان کو نکالنا چاہتا ہے وہ خود انسان کی اپنی خواہشِ نفس ہے۔ اسلامی اسٹیٹ (دین اللہ) انسان پر خود اس انسان کی حکومت و ملکیت بھی نہیں تسلیم کرتا چہ جائے کہ دوسرے انسانوں کی۔

خود انسان کی قائم کردہ حکومت کو دیکھو۔ تم اپنی مرضی سے اگر دشمن ملک میں چندہ بھیجو تو حکومت اس کی روادار نہیں ہو سکتی لیکن حکومت خود جب چاہے تمہارا مال اپنی ضرورت کے لیے بلا تکلف لے سکتی ہے۔ تم اپنی مرضی سے اگر مرنا چاہو ڈوب کر یا جل کر، زہر کھا کر یا کسی طرح خودکشی کر کے، تو حکومت فوراً روک دے گی لیکن جب اسے خود ضرورت ہو تو جبری بھرتی کا حکم دے سکتی ہے۔ گویا تمہارا مال تمہارا نہیں، تمہاری جان تمہاری نہیں بلکہ یہ سب حکومت کی ملک (STATE PROPERTY) ہے ــــ بایں ہمہ انسانی حکومتوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہونے پر بھی دیکھ لو کتنا تنگ ہے۔ کوئی خنزیر

کھائے شراب پیے، زنا کرے، جھوٹ بولے، کلب میں برج کھیلے، ناچ رنگ میں زندگی گذارے، دل میں بغاوت کی تدبیریں سوچتا رہے، اپنے ذہن میں پرے نظامِ حکومت کو سو سو گالیاں دیتا رہے خدائی کا دعویٰ کرے، نبوت کا ادعا کرے اور زبان پر دو معنین الفاظ بغاوت لایا کرے۔ غرض اپنا پرائیویٹ نظامِ زندگی اور بہت حد تک اپنی پبلک زندگی جیسی چاہے بناتا پھرے، حکومت کا کوئی قانون دخیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن برعکس اس کے اسلامی اسٹیٹ نہ صرف جان و مال کو بلکہ ان تمام اعضاء و جوارح کو بھی جن سے کوئی فعل صادر ہو سکے، ان تمام قوائے ظاہرہ و باطنہ کو جن سے کوئی کام لیا جا سکے، اس زبان کو جس سے کوئی گفتار نکل سکے، اس دل کو جس کے اندر کوئی نیت پیدا ہو سکے اور اس نفس کو جو کوئی خواہش و ارادہ کر سکے، غرض ایک ایک شئے کو اللہ کی اور صرف اللہ کی ملکیت تصور کرتا ہے جو انسان کو محض بطور امانت سپرد کی گئی ہے یہ سب فطرۃً (DIVINE STATE PROPERTY) یعنی خدائی حکومت کی بلا شرکت ملکیتیں ہیں۔ ان میں سے کسی شے پر خود اس انسان کی حکومت و ملکیت تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ ان کے استعمال اور طریقِ استعمال کا اختیار بھی انسان کو نہیں، حتیٰ کہ جن قوتوں کے استعمال پر وہ فطرۃً مجبور و مجبول ہے ان پر بھی اسے اختیارِ استعمال حاصل نہیں کہ جس قوت سے چاہے، جہاں چاہے، جب اور جس طرح چاہے کام لے۔ اگر انسان اسلامی اسٹیٹ اور مالک الملک کی وفادار رعایا بننا چاہتا ہے تو اسے اپنی ساری زندگی میں ایک ایک قدم پر ہر امانت کے استعمال کے لیے اسی مَلِکُ النَّاس کے قانون کا پابند ہو کر رہنا پڑے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، کانوں سے حتیٰ کہ دل و دماغ سے وہی اور اسی طرح کام لے سکتا ہے جو کچھ اور جس طرح ان نعمتوں اور امانتوں کا سپرد کرنے والا حکم یا اجازت دے۔ وہ اپنی خواہش سے کھا پی بھی نہیں سکتا، اپنی رفیقۂ زندگی سے بھی اپنی مرضی کے مطابق تمتع حاصل کرنے کا مجاز نہیں۔ اپنی وہ قوتیں بھی اپنی رضا و خوشدلی کے ساتھ اسی مالک کے سپرد کرنی ہوں گی جن کے استعمال پر ہر آن اس کی فطرت اندر سے ابھارتی رہتی ہے۔

یعنی جب آقا کہے کہ فلاں شئے کھاؤ پیو اور فلاں چیز سے تمتع حاصل کرو تو وہ ان ہی چیزوں پر قناعت کر لے اور جب وہ حکم دے کہ یہ ساری چیزیں فلاں وقت سے فلاں وقت تک چھوڑ دو تو وہ ویسا ہی اور اسی طرح تعمیلِ حکم کرے۔ وہ جس شئے کو جب حلال کر دے تو حلال سمجھے اور جب حرام کر دے تو حرام ہی جانے۔ اور اپنے کردار سے واضح کر دے کہ اب ہم خود بھی اپنے مالک

نہیں چہ جائیکہ دوسرے کے مملوک ہوں اور ہم پر اب خود ہماری خواہشوں کی بھی حکومت نہیں چہ جائیکہ دوسرے کی ہو۔ صوم اسی تسلیم و رضا کی مشق کا دوسرا نام ہے۔

یہ پہلا جزء ہے یعنی صرف لا الٰہ جس میں ہر غیر اللہ کی حاکمیت و متبوعیت کی نفی ہے۔ اس کا دوسرا جز الا اللہ ہے۔ اور درحقیقت الا اللہ کے لیے صحیح جگہ ہی اس وقت نکلتی ہے جب لا الٰہ کی تکمیل ہو جائے۔ ورنہ لا الٰہ کا ظرف جتنا وسیع ہو گا الا اللہ کے لیے اسی قدر جگہ تنگ ہو گی۔ لا الٰہ سے نفی غیر ہو جاتی ہے لیکن مقصود صرف نفی غیر اللہ نہیں بلکہ ہر منفی کی جگہ مثبت کو لے آنا مقصود ہے اور وہ مثبت الا اللہ ہے یعنی جب انسان اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم نہ دوسرے کے مملوک ہیں نہ خود اپنی ملک ہیں، نہ ہم دوسروں کے حکم و اختیار کے تابع ہیں نہ اپنے، تو آخر وہ کس کا عبد، کس کا غلام و محکوم اور کس کے حکم و قانون کا تابع فرمان ہے؟ صوم اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ ہم نے فقط اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہر خویش و بیگانہ کے حکم سے نکل آئے ہیں بلکہ ہر طرح کے حکم و حکومت سے نکل کر اللہ کی حکومت و حکم میں آ گئے ہیں۔ اپنی اور ہر غیر اللہ کی غلامی سے نکل کر اللہ کی عبدیت میں داخل ہو گئے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ٹھیک طلوع فجر سے غروب آفتاب تک صرف اپنے نفس کی مخالفت کی نیت سے مفطرات ثلٰث سے کامل پرہیز رکھے، یا کسی معالج کے کہنے سے ایسا کرے یا جیل خانے میں اس کا مقاطعہ جوعی (HUNGER STRIKE) بالکل صومی انداز و مقدار کا ہو، یا یہ سب کچھ وہ کسی مجبوری سے محض اپنے ارادے سے کر لے لیکن پھر بھی یہ صوم نہ ہو گا۔ فاقہ ہو گا، جوگ ہو گا، برت ہو گا، ہنگر اسٹرائک ہو گی، شرارت نفس ہو گی، سب ہو گا مگر صوم نہ ہو گا۔ یہ ساری باتیں ایک مسلم اور رضا کا وفادار بھی کر سکتا ہے اور ایک خدا کا باغی کافر بھی کر سکتا ہے۔ ظاہری شکل دونوں کے فاقے کی یکساں ہو گی، لیکن دونوں میں خط امتیاز کھینچنے والی شئے صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی محکومی و غلامی اور اس کی عبدیت و اطاعت کی نیت اور ابتغائے مرضات اللہ کا جذبہ۔ یہی ہے وہ روح قانون اور تقوی اللہ جو صرف نفی غیر اللہ پر قناعت نہیں کرتا، یہ وہاں جا کر دم لیتا ہے جہاں اُسے الا اللہ کی بھی پوری تجلی نظر آ جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان خالص عبد بنتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کچھ کرتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ سوچتا ہے

اور اگر وہ صرف صائم نہیں بلکہ واقعۃً سائح بھی ہوتا ہے تو وہ اپنی زبان سے قولِ زُور اور فحش و غیبت نہیں نکالتا غصہ نہیں کرتا، حتیٰ کہ بے ضرورت گفتگو بھی نہیں کرتا۔ وہی بولتا ہے جس میں اللہ کی رضا ہو۔ اس طرح وہ صرف معدے کا روزہ نہیں رکھتا بلکہ اس کے سارے اعضا و جوارح صائم سائح بن جاتے ہیں اور اس کا قلب و دماغ بھی روزہ رکھتا ہے۔ "چشم بند و گوش بند و لب بند" کے معنی "سلطان الاذکار" کے سمجھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی ہو لیکن یہ عبدیت کی اصل نہیں۔ "چشم بندن" کے معنی ان تمام چیزوں سے نظر ہٹا لینے کے ہیں جو اللہ کی رضا کے مطابق نہ ہوں اور یہی مطلب "گوش بندن" اور "لب بندن" کا ہے۔ قابلِ غور ہے حدیثِ قدسی کا یہ مضمون کہ "جب بندہ میری جانب ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف بڑھتا ہوں، وہ خراماں خراماں میری طرف آتا ہے تو میں اس کی طرف لپکتا اور دوڑتا ہوا آتا ہوں، یہاں تک کہ میں خود اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ حرکت کرتا ہے اور اس کے وہ کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے ...... فداہ ابی وامی۔ صدق صلی اللہ علیہ وسلم ــــ اس حدیثِ قدسی میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے میں حلول کر جاتا ہے یا "ہمہ اوست" بن جاتا ہے اور بندہ جو جی چاہے کرے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اپنے اندر انابت الی اللہ کا صحیح جذبہ پیدا کر کے اسی کے مطابق سعی و کوشش شروع کرتا ہے تو رحمتِ الٰہی اتنی تیزی سے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے کہ بندہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس عبد کو اتنا قرب و استرضائے الٰہی میں آخر کار ایسی فنائیتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے اعضاء و جوارح کا کوئی حرکت و سکون مرضیِ مولا کے خلاف نہیں ہوتا۔ جو کچھ کرتا، بولتا یا سوچتا ہے قانونِ الٰہی کے مطابق اور اسی کی ہدایت و حکم کے موافق۔

ایسے عبد کا نمونہ اگر دیکھنا چاہو تو کسی صائم سائح کو دیکھ لو جو اپنے طرزِ عمل سے واضح کر دیتا ہے کہ ہم صرف اللہ کے عبد ہیں اور فقط اسی کے حکم و قانون کو مانتے ہیں۔ وہ ایک حلال شے کو ہم پر جب حرام کرتا ہے تو عملاً ہم حرام سمجھ لیتے ہیں اور جب حلال کرتا ہے تو عملی طور پر حلال مان لیتے ہیں ــــ یہی تو وہ عبد ہے جو کسی غیر اللہ کے قانونِ تحلیل و تحریم کو سرے سے نہیں تسلیم کرتا جب وہ بنیاد صوم ہی اس عقیدے پر رکھتا ہے کہ اور تو اور ہم خود بھی اپنے اوپر حاکم نہیں تو اس کے لیے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طاغوت اور خدا کے باغی کے کسی قانون کو تسلیم کر کے اس کی حاکمیت و ربوبیت کو مان لے،

خصوصاً قانونِ حلّت وحرمت کو؟

ہر سال ہمیں کامل ایک ماہ اس عقیدے کی عملی مشق کرائی جاتی ہے کہ کسی شئے کے لیے حلت وحرمت کا حکم وقانون بنانے کا اختیار صرف خدا کا حق ہے اور اس میں کوئی کسی حیثیت سے شریک نہیں، اور ہم شاید یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہر قسم کی قانون سازی کا اختیار بندوں کو بھی حاصل ہے اور یہ حق بندوں کے لیے تسلیم کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں یہی نہیں بلکہ اُس کے حق میں بھی یہ اختیار تسلیم کرنے میں مضائقہ نہیں جانتے جو علانیہ قوانین الٰہی توڑ دے اور اپنی وہ مجلس آئین ساز بنائے جس کی بنیاد خدا کے بجائے بندوں کی اطاعت وحلف وفاداری ہو ایسے طاغیت کا تو وہ قانون بھی قابل تسلیم نہیں جو عین مطابق قانونِ الٰہی ہو۔ جو خود مطیع الٰہی نہیں اس کا کوئی حکم، کوئی قانون اور کوئی فیصلہ خدا کے وفاداروں کے لیے قابل تسلیم ہی نہیں خواہ وہ بظاہر قانونِ الٰہی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

اسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ کسی حکومت میں رہ کر کرنسی نوٹ چھاپیں اور چلائیں تو حکومت پکڑے گی آپ ہزار کہیں کہ صاحب یہ نوٹ بالکل آپ کے نوٹ کے مطابق ہے، وہی کاغذ، وہی تصویر، وہی عبارت، وہی دستخط اور وہی بیل بوٹے ہیں، لیکن آپ ہرگز اسے بچ نہیں سکتے کیونکہ آپ کا نوٹ اگرچہ عین حکومتی نوٹ کے مطابق ہے لیکن صرف اس لیے آپ پکڑے جائیں گے کہ آپ کو یہ حق واختیار حکومت نے نہیں دیا ہے اور اس کا چلانا متوازی حکومت (PARELLEL GOVERNMENT) قائم کرنے کا باغیانہ اعلان ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس بادشاہِ کائنات کی خدائی، اس کی سلطنت اور اس کی زمین وآسمان میں رہ کر کسی کو بطور خود قانون بنانے اور اسے چلانے کا مطلقاً کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا کرنا باغیانہ متوازی حکومت قائم کرنے کا مرادف ہے۔ وہ جعلی کرنسی نوٹ کی طرح ٹھیک الٰہی قانون کے مطابق بھی قانون بنانے یا چلانے کا حق نہیں رکھتا۔ ہاں قانون سازی ـــ وہ بھی جزئی ـــ کا حق صرف ایک شکل میں تسلیم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے وہ اللہ کو اپنا واحد بادشاہ تسلیم کرے اور اس کی کسی قائم کردہ حد کو نہ توڑے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت صرف خلیفۃ اللہ یا نائب حکومت (VICE GERENT OF ALLAH) کی ہوگی یا ان طابعین وناشرین کی جو حکومت کی اجازت وحکم سے کرنسی نوٹ طبع کرتے ہیں۔ پس کسی عالم یا درویش کو، کسی مجلس آئین ساز کو، کسی برادری کو، کسی ڈکٹیٹر

اور کسی صدرِ جمہوریہ کو یہ حق نہیں کہ وہ قانونِ الٰہی کو توڑے اور اپنا قانون بنائے اور چلائے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے نزول کے بعد حضرت عدیؓ بن حاتم دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ہم نے تو کبھی اپنے علماء و مشائخ کو رب نہیں بنایا۔ حضور فرماتے ہیں کہ کیا تم ان کے حلال کردہ کو حلال اور ان کے حرام کردہ کو حرام نہیں سمجھ لیتے تھے؟ عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ۔ حضور فرماتے ہیں کہ بس یہی ہے ربّ بنانا۔

اب ذرا یہ سوچو کہ وہ صائم کتنے مغالطہ میں ہے جو ایک طرف تو روزہ رکھ کر یہ اعلان کرتا ہے کہ تقنینِ حلال و حرام میں ہم نے اپنا رب اللہ کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن اُسی آن وہ یہ خالص ربانی حقِ تقنین خدا کے باغیوں کے سپرد بھی کرتا ہے۔ جو حق اللہ نے کسی ولی، کسی امام، کسی صحابی اور کسی پیغمبر تک کو نہیں دیا وہ حق ــــ صرف تحلیل و تحریم ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے مسائل و مراحل میں ــــ کسی ڈکٹیٹر، کسی صدرِ جمہوریہ اور کسی مجلسِ قانون ساز کے لیے تسلیم کرنے اور اسے جائز مان لینے کے بعد آقرارِ عبدیتِ الٰہی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور ایسے عبد کا صرف صائم ہو جانا فاقہ کشی سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ ایمان تو ہم رکھ سکتے ہیں کہ یہ طواغیت اور یہ باغیانِ خدا نہ ہمارے حاکم ہیں نہ مقنن و حَکَم، نہ قابلِ اطاعت ہیں نہ قابلِ معاونت۔ اگر یہ ایمان بھی نہیں رکھ سکتے تو لیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان اس کے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔

ہم نے صوم کے صرف بنیادی حقائق و مقتضیات پر تبصرہ کیا ہے۔ اس لیے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں، اصل کے ہاتھ آجانے پر فروع خود حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بے محل نہ ہو گا اگر باقی اُمور پر بھی محض سرسری نظر ڈال لی جائے تاکہ صائم ہمیشہ اپنے صوم کا جائزہ لے کر دیکھ سکے کہ وہ تقاضائے صوم کو کہاں تک پورا کر رہا ہے۔

(۱) صوم کا سب سے بڑا فائدہ (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) تو یہ ہے کہ انسان اس اکیلے بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت و وفاداری میں آجاتا ہے اور اپنے نفس کا خود محاسب بن جاتا ہے۔ وہ چاہے تو تنہائی میں بغاوت کر لے مگر ایک حاضر و ناظر شہنشاہ کی حکومت اس خلوت میں بھی اس پر مسلط رہتی ہے جہاں اسے کوئی نہیں دیکھتا اور جہاں وہ کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔

(۲) محاسبۂ نفس کے علاوہ اس میں ضبطِ نفس بھی پیدا ہو جاتا ہے اور تحمل و صبر بھی۔ جو شخص خورونوش اور تسکینِ حیوانیت

جیسے کٹھن جذبات کا مردانہ وار مقابلہ کرے وہ دنیا کے تمام شدائد و مصائب کا باسانی مقابلہ کر سکتا ہے۔

(۳) نعمتوں کی صحیح قدردانی بھی ایک صائم ہی میں ہو سکتی ہے۔ ترک لذت کے بعد اس کے حصول میں جو لطف ہی اسے وہ کیا جانے جس نے ترکِ لذات کی لذت ہی نہ چکھی ہو اس قدر نعمت کا لازمی نتیجہ جذبہ شکر کا ازدیاد ہے۔

(۴) صحیح انسانی ہمدردی کا جذبہ ایک صائم ہی کے اندر ہو سکتا ہے۔ جس نے کچھ تکلیفیں جھیلی ہوں وہی دوسروں کی تکلیفوں کا بھی احساس کر سکتا ہے۔

(۵) پوری جماعت میں ہمرنگی و مساوات کا عجیب سبق صوم سے حاصل ہوتا ہے۔ بڑے چھوٹے سب ایک اکیلے فرمانروا کی اطاعت میں یکرنگ ہو جاتے ہیں۔ امیر اپنے کو غریبوں جیسا بھوکا اور غریب امیروں کو اپنے جیسا مجبور پاتا ہے اور اس طرح سرمایہ دار و مزدور کی ٹکر کا جذبہ بڑی حد تک فنا ہو جاتا ہے۔

(۶) صیام رمضان کے بعد لاکھوں روپے بشکل فطرہ غریبوں کی جیب میں جاتے ہیں جس سے غربا کی بھی عید ہو جاتی ہے۔ اس معاشی نظام و تقسیم کا سبب دراصل ماہ صیام ہی ہے۔

(۷) تقویٰ بڑے بلند درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو حلال کو رضائے الٰہی کے لیے ترک کر دے وہ حرام کو اختیار کر کے اس کی ناراضی کیوں مول لینے لگا؟ گویا صائم کا معیار ترک و اختیار بدل جاتا ہے اور اس کا طرز فکر الٰہی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ دیگر حقائق صوم، صائم پر خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں اگر وہ روزہ رکھنے کے ساتھ غور و فکر بھی کرے۔ یہ تو وہ فوائد ہیں جو اسی زندگی میں حاصل ہوتے ہیں۔ اخروی منافع کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ حدیث قدسی کے یہ الفاظ عجیب فرحت بخش روح ہیں کہ کل حسنة بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف الا الصوم فانه لی وانا اجزی به ہر نیکی کا اجر دس سے لے کر سات سو گنے تک ہے بجز صوم کے کہ وہ تو خاص میرے لیے ہے یا اس کا اجر میرے ذمہ ہے اور اس کا اجر تو بس میں ہی دوں گا۔ اللہ اللہ اس "لی" کی لطافت اور اس اَنَا اَجْزِیْ بِہٖ کی وسعت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ نماز نہ پڑھو تو پکڑ لیے جاؤ، زکوٰۃ نہ ادا کرو تو دار و گیر شروع ہو جائے، حج نہ کرو تو باز پرس کی بوچھار ہو ان میں سے کوئی سا رکن دین ایسا نہیں جو چھپا کر کیا جاتا ہو سب میں اظہار لازمی ہوتا ہے اور کسی سے بغیر مواخذے کے

گریز ہی دشوار ہے لیکن صرف ایک ہی رکن صوم ایسا ہے جس سے گریز ہر وقت ممکن ہے لیکن خدا کا بندہ یہ خیانت نہیں کرتا۔ وہ جب چاہے تنہائی میں اپنا روزہ توڑ دے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ کیوں؟ کچھ نہ کچھ تو للہیت ہوتی ہوگی۔ اگر یہ عبادت صحیح طور پر ادا ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خالص اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ اور یہ "لی" اس خالصیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پھر اس کے اجر کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ بندوں کی پیمائش سے اس کے اجر کا طول و عرض نہیں معلوم کیا جا سکتا، اس لیے خدا نے خود اس کا ذمہ لے لیا ہے کہ انا اَجزِی بہٖ۔ اس کی جزا تو بس میں ہی دوں گا۔ اس مولا کی کریمی دیکھو چند فاقوں کا کتنا بے حساب اجر دینے پر آمادہ ہے۔ ایک شہنشاہ صلہ دینے کا وعدہ فرما رہا ہے اور صلہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ خود ہی اس کی کوئی تحدید نہیں فرماتا۔ اللہ کے روزہ دار بندو! اپنی قسمت پر ناز کرو، وہ داتا کیا کچھ دینے پر تلا ہوا ہے۔ انا اَجزِیْ بہ کو انا اُجزٰی بہ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی میں خود اس کی جزا بن جاتا ہوں۔ اور اس کا اجر یہ ہے کہ میں خود اسے اجر میں مل جاتا ہوں۔

اس کے خود مل جانے پر کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ "تخلّق باخلاق اللہ" کا صحیح نقش شاید صوم سے بڑھ کر کسی عبادت میں نہیں۔ تخلق باخلاق اللہ کے معنی ہیں مولا کے رنگ میں رنگ جانا اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا۔ اس کی توحید خالص سورۂ اخلاص میں یوں بیان ہوئی ہے "اللہ بے نیاز ہے، وہ جورو بچے کا محتاج ہے نہ کھانے پینے کا"۔ پس جو اللہ سے تقرب چاہتا ہے وہ اپنے کو کچھ دیر کے لیے سہی اسی رنگ صمدانیت میں رنگ لے اور جس طرح اس کا مولیٰ ان تمام مادی حوائج سے بے پروا ہے اسی طرح وہ بھی ہو جائے۔ پھر قرب الٰہی کا اندازہ کرے اور دیکھے کہ کس طرح اس کا آقا ہی اس کا اجر بن کر مل جاتا ہے۔ جزا میں اس کے ملنے کا مطلب اس کو اپنے قبضے میں لے آنا نہیں بلکہ اس کی رضا کا حاصل ہو جانا ہی عین اسی کا مل جانا ہے۔

لب فرو بند از طعام و از شراب سوئے خوانِ آسمانی کن شتاب

DECISIVE MOMENTS IN THE HISTORY OF ISLAM

By M.A. Enar, Assistant Director, Press Deptt., Ministry of the Interior, Cairo. Demy 8vo., Rs. 4/8

The efforts of Islam to conquer the ancient world aimed not merely to win lands and empires, but particularly to change the institutions of the ancient world, and to replace them with new institutions based on the lofty and tolerant spirit of Islam. These efforts represented, in general, a world struggle between the rising Islam and Christendom. Success or failure in every decisive encounter between East and West and between Islam and Christendom, always represented a phase of this struggle. This historical fact is fully explained in this book.

It deals with some of the most decisive encounters between Islam and Christendom, such as the Arab siege of Constantinople, the battle of Tours, the famous Moslem naval invasions, Moslem invasions of Rome, idea of the Crusades, battle of Zallaka, fall of Granada, fall of Moorish civilization, etc. It also contains some critical studies on the characteristics and policy of Arab conquests, diplomacy in Islam, slavery, chivalry, etc.

MUHAMMAD: THE HOLY PROPHET

By Hafiz Ghulam Sarwar, M.A., Post 8vo., Rs. 3/12

The object of this book is to present the facts of the promulgation of the faith of Islam by the Holy Prophet and the events of his life supported by quotations from the Holy Quran in a simple, straightforward manner. He who has an unbiased mind will see the truth in its proper light but every one whether Muslim or non-Muslim will enjoy the reading of this book. The facts of the life of the Holy Prophet are marshalled as an army on parade which the reader may review without being tutored at every step of his journey through the lines. They are there—open, unvarnished, without gloss and without any personal bias except such enthusiasm for the truth as is natural to a follower of Islam.

PAKISTAN: A NATION

By El-Hamza. Demy 8vo., 26 Maps, Rs. 3/-

A scientific un-exaggerated, exhaustive representation of the case for the partition of India—intensely realistic, accurate and compact.

LIFE AND WORK OF IBN KHALDUN

By M.A. Enan, Assistant Director, Press Deptt., Ministry of the Interior, Cairo. Demy 8vo., Rs. 3/8

A comparative and critical study of the life of the historian and philosopher, Ibn Khaldun, acknowledged by Western critics to be the founder of modern sociology, his intellectual and social legacy, his method and style. It also contains a full review of his Arabic works about monarchical politics which he scientifically developed and, lastly, an exhaustive exposition of all the Western studies published about him and his work, together with a comparison between him and Machiavelli and their theories about the State.

IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY

By K.G. Saiyidain, M.Ed. (Leeds), Director of Education, Jammu and Kashmir. Demy 8vo., Rs. 2/8

It is a lucid presentation of the creative ideology of Iqbal, not only as an educational philosopher but as a great thinker, a great humanist and the most gifted and significant interpreter of the message of Islam for the modern world.

THE INDIAN CONSTITUTIONAL TANGLE

By Jamil-ud-Din Ahmad, M.A., Lecturer, Muslim University, Aligarh. Demy 8vo., Re. 1/4

A complete and convincing survey of the political situation in India as it has developed since the outbreak of war up-to-date.

The respective policies and attitudes of Congress and Muslim League with regard to War and the constitutional problems, interim and final, exhaustively treated and their justification or otherwise discussed.

SOME RECENT SPEECHES AND WRITINGS OF Mr. JINNAH

Collected and edited by Jamil-ud-Din Ahmad, M A. Demy 8vo., Rs. 4/8

A compendious collection of the soul-stirring utterances of the great politician, parliamentarian and leader during recent years. It gives an insight into the working of the mind of the man who holds the key to the Indian situation and round whom the whole Indian body-politic revolves today. Indian politics in a nutshell. Clear-cut survey, bold enunciation of views, masterly grasp of realities...speeches which have shaken all camps and galvanised millions into action Indeed this is the book of the hour.

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس نے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصُولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب دیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

صرف سرورق پائنیر پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا

Registered No. L. 4186

جلد ۲۱ — عدد ۳
۱۹۴۱ء

رمضان
شوال
ذی قعدہ
ذی الحجہ
۱۳۶۰ھ

۴۸۹

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ ۔ لاہور

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول مجلد دو روپے قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات — یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۸/- مجلد ۲/-/- محصولڈاک ۴/-

فہرست مضامین

بابت ماہ رمضان و شوال سنہ ۶۱ھ (اکتوبر و نومبر ۴۲ء) جلد ۲۱ عدد ۳، ۴

معذرت افسوس ہے کہ کاغذ کی نایابی کے سبب سے پرچے کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی۔ چار مہینہ سے کاغذ فراہم کرنے کے لئے انتہائی جد و جہد کی جا رہی ہے لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ بازار میں اول تو کاغذ ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو خفیہ طور پر دس بارہ گنی قیمت پر ملتا ہے۔ یہ چار مہینہ کے مشترک پرچے جو اس وقت شائع کئے جا رہے ہیں۔ دراصل رمضان اور شوال کے پرچے تھے اور اپنے وقت پر تیار کئے جا چکے تھے۔ مگر اسی وجہ سے رکے پڑے تھے اب مجبوراً انہیں چار مہینہ کا ایک پرچہ بنا کر شائع کیا جا رہا ہے اور اس کے لئے بھی کاغذ بڑی مشکل سے فراہم ہوا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس

سرکلر روڈ لاہور سے طبع کرا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی اشاعت کے اشارات میں اُس اعتراض کا اصولی جواب دیا جا چکا ہے جو آیت وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ کی تفسیر پر ایک صاحب نے وارد فرمایا ہے۔ اب ہم اُن دلائل پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جن کا سہارا جناب معترض نے لیا ہے اور جن پر اس طرزِ خیال کے لوگ بالعموم اعتماد کیا کرتے ہیں۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جب تم "فتنہ" سے مراد کفر کا غلبہ اور کفار کی بالادستی لیتے ہو، اور جہاد و قتال کی غایت یہ قرار دیتے ہو کہ تمہاری اس تفسیر کے مطابق جس چیز کا نام "فتنہ" ہے وہ مٹ جائے اور اس کی جگہ "اللہ کا دین" قائم ہو، تو اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام دو بالکل متضاد حیثیتیں اختیار کر رہا ہے۔ ایک طرف کہتا ہے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے) اور دوسری طرف غیر مسلموں کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ وہ اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں، اور ان کے قوانین کا اجرا موقوف کر کے زبردستی اُن پر اللہ کے دین کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ایک طرف لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ کہہ کر غیر مذاہب کے پیرووں کو اپنے مذہب و عقائد پر قائم رہنے کی آزادی دیتا ہے اور دوسری طرف اُن سے ٹھیک اسی بات پر لڑائی چھیڑتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے اصولوں کے مطابق معاملاتِ دنیا کا انتظام کیوں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام ہرگز اس تضاد کا حامل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تمہاری تفسیر صحیح نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر غیر اسلامی حکومت کا نفسِ وجود اسلام کی نگاہ میں فتنہ ہوتا اور اس کو مٹانے پر مسلمان مامور ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کی غیر اسلامی حکومت میں وزارت کا عہدہ طلب کرتے اور اپنی وزارت کے دور میں مصر کے شاہی قوانین کے پابند رہ کر کام کرتے جیسا کہ آیت مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ سے ظاہر ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر تمہاری اس تفسیر کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسلام دنیا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑتا ہے اور اپنے پیرووں پر جارحانہ جنگ کا ایک ایسا فرض عائد کر دیتا ہے جس کی وجہ سے

مسلمان دنیا بھر کو دین الحق کے سوا نہیں رہنے دے سکتے۔ اس تفسیر کی رو سے تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف تمام غیر مسلم حکومتوں کے خلاف بلکہ ان مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی علم جہاد بلند کریں جن میں اسلامی حدود و قوانین نافذ نہیں ہیں۔ اور جب یہ ہمارا نظریہ اور یہ ہمارا دینی فریضہ ہو تو کس طرح ممکن ہے کہ غیر مسلم ہم کو اپنا پُرامن ہمسایہ سمجھ کر باطمینان ہمارے ساتھ معاملت کر سکیں اور غیر مسلم حکومتیں اپنے حدود عمل میں ہمارے وجود کو برداشت کر سکیں؟

ان دلائل میں سے پہلی دلیل دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کسی شخص کا بجائے خود ایک عقیدے کو ماننا اور اپنی زندگی میں ایک خاص طریقہ کی پیروی کرنا، یہ اور چیز ہے، اور اس کا اپنے نظریات کے مطابق اجتماعی زندگی کے لیے ایک نظام بنانا اور اس نظام کو بزور ایک ملک کے باشندوں پر جاری کر دینا بالکل ایک دوسری چیز۔ معترضین ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھتے ہیں اور ان کے فرق کو نظر انداز کر کے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ وغیرہ آیات کو ان مجموعہ پر چسپاں کر دیتے ہیں، حالانکہ ان آیات کا تعلق صرف امر اول سے ہے۔ بلاشبہ ہم کسی غیر مسلم کو مجبور نہ کریں گے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر اسلامی عقیدہ قبول کرے یا اپنی مذہبی عبادات کو ترک کر کے نماز روزہ کی پابندی اختیار کرلے۔ لیکن ہم اس کا یہ حق کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اخلاق، تعلیم، تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست وغیرہ اجتماعی امور کے متعلق اپنے نظریات کو حاکمانہ قوت کے ساتھ بجبر ہم پر مسلط کر دے۔ دوسروں کو ان کے مسلک پر چلنے دینا بے شک رواداری ہے، مگر یہ کوئی رواداری نہیں ہے کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلط برداشت کریں، حتیٰ کہ اگر وہ زنا کو حلال سمجھتے ہوں اور لوگوں کو اس کی عام اجازت دیتے ہوں تو ان کی حکومت میں بے بس رعیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے ہماری سوسائٹی میں زنا پھیلتی چلی جائے اور ہم اسے گوارا کریں، اگر وہ سود کو جائز سمجھتے ہوں اور خود ان کی حکومت سودی لین دین کرتی ہو تو ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی بڑے سے بڑا زاہد و متقی تک سود کے غبار سے نہ بچ سکے اور ہم ایک دیا سلائی اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ خرید سکیں جب تک کہ اس کی قیمت میں سے سود کا ایک حصہ بالواسطہ ٹیکسوں کی شکل میں ہماری جیب سے نہ نکل جائے، اگر وہ دہریت و الحاد کے نظریات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ملک کی عمومی تعلیم کا پورا نظام انہی نظریات اور اسی ذہنیت اور اسی

ملحدانہ اخلاق پر تعمیر ہو جائے، اور باشندگانِ ملک کے لیے ترقی و خوش حالی کے تمام دروازے اِس جہنم کے دروازے کے سوا بند ہو جائیں اور ہمارا کوئی بڑے سے بڑا خدا پرست بھی اپنی نسل کو اس الحاد اور ملحدانہ اخلاق کے اثرات سے نہ بچا سکے۔ اگر وہ خدا کے قانون کو منسوخ کر کے خود قوانین بنائیں اور ملک کا نظام تمدن اُن قوانین پر قائم کریں تو ہماری معاشی و معاشرتی اور تمدنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مجبوراً اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور اُس قانون پر چلنے لگے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ کوئی ہمیں بتائے کہ آخر یہ رواداری کی کونسی قسم ہے اور لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین کا یہ مطلب کس عقل کی رو سے صحیح ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے دین میں جو اکراہ ہو اسے ہم برداشت کریں۔

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظم کو قائم کرنے کے لیے بہرحال ایک قوتِ قاہرہ کی ضرورت ہے جسے "اسٹیٹ" یا ریاست کہتے ہیں ۔۔۔ اس ضرورت کا انکار انارکی پر اعتقاد رکھنے والوں کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا، یا پھر اشتراکی تصوف میں ایک ایسے مقام کا تصور کیا گیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی حیاتِ اجتماعی اسٹیٹ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گی لیکن یہ صرف عالمِ خیال کی باتیں ہیں جن کی تائید میں کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی بتاتا ہے کہ تمدن کا قیام ایک قوتِ قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے ۔۔۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت جو اپنے قہر و غلبہ سے نظامِ تمدن کو قائم رکھتی ہے بجائے خود کسی نہ کسی نظریہ اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک کی قائل ہوتی ہے، اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لیے ایک لائحۂ عمل بناتی ہے، اسی لائحۂ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے، اور تمدن کی شکل کے بننے اور بگڑنے میں اس قہر کی نوعیت اور اس لائحۂ عمل کی اصولی و تفصیلی صورتوں کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں، انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک طوعاً و کرہاً اس سانچے میں ڈھل کر ہی رہتی ہے جسے اسٹیٹ اپنے قہر و تسلط سے بنا دیتا ہے۔ جو لوگ کسی اسٹیٹ کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بنیادی نظریہ اور اس کے تفصیلی لائحۂ عمل پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح اس سے راضی نہ ہوں، لیکن انھیں چار و ناچار اپنے عقیدہ و مسلک کے ۹۰ فی صدی حصہ سے دست بردار ہو کر اسٹیٹ کے عقیدہ و مسلک کی

چلنا پڑتا ہے اور باقی دس فی صدی میں بھی ان کے عقیدہ و مسلک کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسٹیٹ کی اس نوعیت کو ملحوظ رکھنے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ اجتماعی زندگی کے لیے اسٹیٹ بہرحال ہے ناگزیر، ایک صاحب فکر و نظر آدمی کے لیے اس حقیقت کا ادراک کچھ مشکل نہیں رہتا کہ جو گروہ آج کل کے محدود معنوں میں محض ایک "مذہب" کا معتقد نہ ہو بلکہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی یعنی "دین" پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اگر اپنے اعتقاد میں سچا ہو اور اپنے اعتقاد کے خلاف زندگی گزارنا نہیں چاہتا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر خود اس قوتِ قاہرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے جو نظم اجتماعی کی صورت گری کرتی ہے اور اپنے زور سے اس کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریگا تو دوسرے اس قوت پر قبضہ کریں گے اور پھر یہ گروہ مجبور ہوگا کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے کم از کم ۹۰ فی صدی امور میں اپنے "دین" کے بجائے اُن کے "دین" پر چلے۔ متمدن زندگی میں "اکراہ" لامحالہ ہم میں سے کسی ایک کو کرنا ہی پڑے گا، اگر ہم نہ کریں گے تو کفار کریں گے، لہٰذا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بجائے اس کے کہ کفار اس دائرے میں ہم پر اکراہ کریں اور ہمیں جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم اُن پر اکراہ کریں اور انہیں اس مقام کے قریب لا کھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو ان کو بآسانی جنت کا راستہ مل سکتا ہے۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے، اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کا مالک اللہ ہے، اس کی زمین پر بسنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے، اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اُس کو پہنچتا ہے جو اس کا مطیع فرمان ہو اور اس کے قانونِ فطری و شرعی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ظالم ہے، غاصب ہے، باغی ہے۔ اس کی نافرمانی صرف خلافِ حق ہی نہیں بلکہ زمین کے انتظام میں فساد اور اہلِ زمین کے لیے فتنہ کی موجب بھی ہے۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ جو لوگ ضلالت پھیرے ہوئے ہیں اور اُس کے قانونِ فطری و شرعی کی پیروی سے منحرف ہیں ان کو زمین میں جینے کا حق بھی نہیں ہے، لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت اور اس کا انتہائی حلم ہے کہ وہ ان کو نہ صرف جینے کی مہلت دیتا ہے، بلکہ ان کو ان کے کفر و شرک، دہریت اور الحاد پر اس حد تک قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے جہاں تک ان کی بغاوت دوسرے بندگانِ خدا کے لیے فتنہ و فساد کی موجب نہ ہو سکے، البتہ وہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ لوگ اس کے قانونِ شرعی

کو منسوخ کرکے اپنے خود ساختہ قوانین پر اس کی زمین کا نظم و نسق چلائیں اور اس کی زمین کو فساد سے بھر دیں۔ اس لیے وہ اپنے قانونِ شرعی پر ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کفار کو دینِ حق پر ایمان لانے کے لیے تو مجبور نہ کرو لیکن غلبۂ کفر و کفار کے فتنہ کو پوری طاقت سے مٹانے کی کوشش کرو یہاں تک کہ زمین کا انتظام علاً میرے "دین" پر قائم ہو جائے اور جو میرے دین کو نہیں مانتے وہ کابر "نہیں بلکہ "صاغر" بن کر رہیں۔

ان حقائق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد دوسری دلیل کا زور آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فی الواقع خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے تو پھر ان کی زندگی کا مشن بھی اس کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا جو ہر رسولِ برحق کا مشن رہا ہے، یعنی خدا کے دین کو ہر دوسرے دین پر غالب کر دینا۔ اس مقصد وحید سے ہٹ کر جن لوگوں کی رائے میں حضرت یوسف دین اللہ کے بجائے دین الملک پر زمین کا انتظام کر رہے تھے ان کی رائے اگر تسلیم کر لی جائے تو یوسف صدیق اور سر سکندر و فضل الحق میں کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس معاملہ میں جو لوگ حقیقت سے دور چلے گئے ہیں انھوں نے دراصل قصۂ یوسف علیہ السلام کو نہیں سمجھا۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے وقت کے فرعون سے جو کہا تھا کہ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ، تو یہ ان کی طرف سے محض ملازمت کی ایک درخواست تھی جو دربار شاہی میں قبول ہو گئی اور ان کو وہ منصب مل گیا جو اکبر کے ہاں ٹوڈرمل کا منصب تھا۔ حالانکہ وہاں صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ابتداءً دینِ حق کی اقامت کے لیے وہی راستہ اختیار فرمایا تھا جو انبیاء علیہم السلام اختیار فرماتے رہے ہیں، یعنی دعوتِ عام، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کی تربیت و تنظیم، پھر انھیں ساتھ لے کر اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس دعوت کا سلسلہ جیل ہی میں شروع کر دیا تھا جس کے مواعظ میں سے ایک بے نظیر وعظ سورۂ یوسف کے پانچویں رکوع میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن آگے چل کر ان کے سامنے یکایک ایک ایسا موقع آ گیا جس سے وہ اپنے مقصود تک مختصر راستہ سے پہنچ سکتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی اور اس کی سہیلیوں کے معاملہ میں جس پاکیزہ اور مضبوط سیرت کا اظہار ان سے ہوا تھا

اور پھر تعبیر خواب کے معاملہ میں جس بصیرت کا ثبوت انھوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے فرعون ان کا اس حد تک معتقد ہو چکا تھا کہ اگر وہ اس وقت حکمرانی کے کامل اختیارات اس سے طلب کرتے تو وہ بلا تامل پیش کر دیتا۔ اس لیے انھوں نے تحریک عمومی کی راہ سے اپنا مشن پورا کرنے کے بجائے اقتدار حکومت پر فوراً قبضہ کر کے دین حق قائم کر دینے کو زیادہ قریب کا راستہ پایا اور فرعون سے مطالبہ کر دیا کہ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ "زمین مصر کے تمام وسائل و ذرائع میرے اختیار میں دے"۔ یہ محض وزیر مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ڈکٹیٹر شپ کا مطالبہ تھا اور اس کے نتیجہ میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اٹلی کا بادشاہ مسولینی کا معتقد نہیں بلکہ محض اس کی پارٹی کے اثر سے مجبور ہے، اور وہاں بادشاہ خود حضرت یوسف کا مرید ہو چکا تھا۔ حضرت یوسف کے اس اقتدار کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ "اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا۔ وہ اس کے جس حصہ کو چاہتا اپنی جگہ بنا سکتا تھا"۔ یعنی پورا ملک اس کے قابو میں تھا۔ پھر اس کی مزید شہادت سورۂ مائدہ میں ملتی ہے جہاں حضرت موسیٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ "اے قوم! یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا کہ تم میں انبیاء پیدا کیے تھے، تم کو حکمران قوم بنایا تھا اور تمھیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کو مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا تھا اس کی وجہ سے وہاں آخر کار مکمل انقلاب رونما ہوا۔ فراعنہ کے بجائے بنی اسرائیل حکمران ہوئے اور ان کو وہ عروج نصیب ہوا جو ان کی ہمسر قوموں میں کسی کو حاصل نہ تھا۔ پھر جو نقش اثر حضرت یوسف نے مصر میں چھوڑا اس کی شہادت سورۂ مومن سے ملتی ہے جس میں حضرت موسیٰ کے ہمعصر فرعون کو خطاب کر کے قبطی قوم کا ایک صاحب ایمان شخص کہتا ہے وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِىْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا "تمھارے پاس یوسف روشن نشانیاں لے کر آئے تھے مگر پہلے تو تم ان چیزوں کی طرف سے شک میں رہے جنھیں وہ لائے تھے اور جب وہ انتقال فرما گئے تو تم نے کہا اب اللہ کوئی رسول نہ بھیجے

یعنی اس پایہ کا شخص اب نہیں آسکتا۔

حضرت یوسفؑ کے معاملہ کی حقیقت جاننے کے بعد کون اس سے یہ استدلال کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت کا پرزہ بننا برحق ہے کیونکہ ایک نبی برحق ایسا کرچکا ہے۔ رہی آیت مَاكَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ جس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعونی قوانین کی پابندی کرتے تھے، تو اگرچہ اس آیت کے معنی و مفہوم میں بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے لیکن اس کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے اگر اسی کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ حضرت یوسفؑ کے دورِ حکومت میں جس موقع پر یہ معاملہ پیش آیا (اور قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور ہی کا واقعہ تھا کیونکہ آنجنابؑ کے عزیز مصر ہونے کے چند ہی سال بعد وہ مشہور ہفت سالہ قحط شروع ہوا جس میں آپؑ کے بھائیوں کو غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آنا پڑا تھا) اس وقت تک مصر میں فوجداری قانون وہی رائج تھا جو پہلے سے چلا آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ملک کے نظام تمدن کو آنِ واحد میں نہیں بدلا جاسکتا۔ یہ کام بہرحال تدریج ہی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی عرب کے نظامِ تمدن کو بدلتے بدلتے دس سال لگ گئے تھے۔ وراثت کا قانون ۳ھ یا ۴ھ ہجری میں بدلا گیا، نکاح و طلاق کے قوانین ہجرت کے بعد پانچ چھ سال میں مکمل طور پر نافذ کیے گئے، فوجداری قوانین کی تکمیل میں پورے آٹھ سال لگ گئے، ملک کا معاشی نظام بتدریج ۹ سال میں بدلا گیا، شراب کا قطعی انسداد ۸ھ میں ہوا اور سود کی کلی ممانعت ۹ھ میں کی گئی۔ اسی طرح اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ملک کے قوانین بدلنے میں تدریج سے کام لیا ہو اور ایک خاص وقت تک ان کے زمانہ حکومت میں سابق قوانین جاری رہے ہوں تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ایک پیغمبر خدا کے سوا دوسروں کے جاہلی قوانین کو جائز سمجھ کر ان کی پابندی کرتا تھا؟

رہی تیسری دلیل تو اسے دراصل دلیل کے بجائے عذر کہنا چاہیے۔ اس عذر کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں اور یہاں صرف ایک حدیث سنانے پر اکتفا کرتے ہیں جسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ

والجهاد ماضٍ منذ بعثني الله الى ان يقاتل آخر هذه الامة الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل	اور جہاد میری بعثت کے وقت سے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جبکہ اس امت کا آخری گروہ دجال سے جنگ کریگا۔ نہ کسی ظالم کا ظلم اسے باطل کرسکتا ہے اور نہ کسی عادل کا عدل۔

(یعنی نہ اُسے اس عذر کی بنا پر روکا جاسکتا ہے کہ اس وقت جیسے جابر ہم پر مسلط ہیں، نہ اس بات کو بہانہ بنایا جاسکتا ہے کہ حکومت اگرچہ کفار کی ہے مگر ہم کو امن نصیب ہے اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے، اور نہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر ان کے اپنے ملک میں عدل کا دور دورہ ہو تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں، اور باہر کی دنیا میں جو ظلم و فساد برپا ہو اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں)

تفہیم القرآن

(۶)

آل عمران

(از رکوع ۱ تا رکوع ۹)

اس سورۃ میں ایک مقام پر "آل عمران" کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

اس میں چار تقریریں شامل ہیں۔ پہلی تقریر آغاز سورۃ سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے اور وہ غالباً جنگ بدر کے بعد قریبی زمانہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔ دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (اللہ نے آدم اور نوح اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے لے کر چھٹے رکوع کے اختتام تک سنہ ۹ھ میں وفد نجران کے موقع پر نازل ہوئی۔ تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے۔ چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختم سورہ تک جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ ان مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے وہ مقصد و مدعا اور مرکزی مضمون کی یکسانیت ہے۔ سورہ کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے، ایک اہل کتاب (یہود و نصاریٰ)، دوسرے وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۃ بقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ اُن کی اعتقادی

گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بلا رہا ہے جس کی دعوت شروع سے تمام انبیار دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرۃ اللہ کے مطابق ایک ہی دین حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستہ سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں وہ خود اُن کتابوں کی رو سے بھی صحیح نہیں ہیں جن کو تم کتب آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کر سکتے۔ دوسرے گروہ کو، جو اب بہترین امت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جا چکا ہے، اُسی سلسلہ میں مزید ہدایات دی گئی ہیں جو سورۂ بقرہ میں شروع ہوا تھا۔ انھیں پچھلے انبیار کی امتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان راہوں پر چلنے سے بچیں۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہل کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ اور انھیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر متوجہ کیا گیا ہے جن کا ظہور جنگ اُحد کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ اس طرح یہ سورۃ نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزار میں مسلسل و مربوط ہے بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مقام بقرہ سے متصل ہی ہے۔

سورۃ کا تاریخی پس منظر یہ ہے:

(۱) سورۂ بقرہ میں اِس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمائشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت متنبہ کر دیا گیا تھا وہ پوری شدت کے ساتھ پیش آ چکی تھیں جنگ بدر میں اگرچہ اہل ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی لیکن یہ جنگ گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے کی ہم معنی تھی۔ اس اولین مسلح مقابلہ نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی،

اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینہ کی یہ چھوٹی سی بستی جس نے گرد و پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی تھی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ اِن حالات کا مدینہ کی معاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اول تو ایک چھوٹے سے قصبہ میں جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی، یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آ جانے سے ہی معاشی توازن بگڑ چکا تھا، اس پر مزید مصیبت اِس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہو گئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، اِن لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کھلم کھلا قریش اور دوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلا دلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اِس سلسلہ میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کے ہمسائگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے ان کا پاس و لحاظ بھی انھوں نے اٹھا دیا تھا۔ آخر کار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گزر گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند مہینہ بعد بنی قَینُقاع پر، جو ان یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر تھا، حملہ کر دیا اور انھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مدینہ کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابۂ کرام اس زمانہ میں بالعموم ہتھیار بند سوتے تھے، شب خون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نگاہوں سے

اوجھل ہوجاتے تو صحابۂ کرام گھبرا کر آپ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چھڑکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکہ سے تین ہزار کا لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہوگیا اور اُحد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی جو جنگ اُحد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینہ سے نکلے تھے مگر راستہ میں سے تین سو منافق یکایک الگ ہو کر مدینہ کی طرف پلٹ گئے اور جو سات سو آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی جس نے دوران جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مارآستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگ اُحد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصہ تھا لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا، اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک خاص طرز فکر اور نظام اخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی جس کی اخلاقی تربیت ابھی تکمیل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس کی پوری سرگزشت پر ایک مفصل تبصرہ کیا جائے اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں ان میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے جو دنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

آ، ل، م۔ اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے حقیقت میں اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اُس نے تم پر[1] یہ کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے[2] اور اُن کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اِس سے پہلے اُس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے توراۃ اور انجیل نازل کی تھیں۔ نیز حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز بھی اس نے نازل فرمائی۔ اب جو لوگ اُس کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی، اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں[3]، وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے[4]۔ اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا

---

[1] خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

[2] یعنی یہ کتاب سراسر علمِ حق پر مشتمل ہے۔ اس میں باطل اور جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں ہے، اس کے بیانات میں سے کوئی چیز قیاس و گمان اور اندازے پر مبنی نہیں ہے، اس میں کہیں نظر و رائے اور فیصلہ کی غلطی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، ہر معاملہ میں یہ جو کچھ کہتی ہے حق ہی کہتی ہے۔

[3] یعنی وہ کائنات کی تمام حقیقتوں کا جاننے والا ہے، لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہو وہ سراسر حق ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ خالص حق صرف اُسی کتاب میں انسان کو میسر آسکتا ہے جو اُس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔

[4] اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ تمھاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے نہ تم خود جان سکتے ہو، لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کیے بغیر تمھارے لیے چارہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس نے تمھارے استقرارِ حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمھاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہ دنیا کی زندگی میں تمھاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا، حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو تو وہ یہی ہے۔

نہیں ہے۔ وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد[۵] ہیں، اور دوسری متشابہات[۶]۔ جن لوگوں کے دلوں

۵ محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ "آیات محکمات" سے مراد وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنی و مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں، جنھیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات "کتاب کی اصل بنیاد ہیں"، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ انہی میں اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے، انھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، انھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے، انہی میں دین کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں، انہی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالب حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بجھانے کے لیے آیات محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرتاً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

۶ متشابہات، وہ جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے ـــــ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا جب تک کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس میں انسان کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے بنیادی امور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماورا ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں نہ آسکتی ہیں، جن کو نہ اس نے کبھی دیکھا نہ چھوا نہ چکھا، اُن کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انہی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان مل سکتے ہیں جن سے ہر سامع کے ذہن میں اُن کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کیے جائیں جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن میں ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے، اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں یہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں ٹیڑھ ہے وہ فتنہ کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ اُن کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں"۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ اہلِ ایمان اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ "مالک! جبکہ تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے تو اب کہیں ہمارے دلوں کو پھر کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، تو ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے"۔ ع ۱

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے انھیں اللہ کے مقابلہ میں نہ مال کچھ کام دیگا

(بقیہ صفحہ سابق) تک پہنچا دے یا اس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے، ورنہ اس کے مفہوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی اتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا حتی کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اُس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بوالفضول یا فتنہ جو ہوتے ہیں ان کا تمام تر شغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم جانتے ہی نہیں تو ان پر ایمان کیسے لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے۔ اور جب آیاتِ محکمات میں غور و فکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خلجان پیدا نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کا سیدھا سادہ مفہوم اس کی سمجھ میں آ جاتا ہے اس کو وہ لے لیتا ہے، اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے وہاں کھوج لگانے اور موشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مجمل ایمان لا کر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

نہ اولاد۔ وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ اُن کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون کے ساتھیوں اور اُن سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس جن لوگوں نے تمہاری[1] دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اُن سے کہدو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور جہنم بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمہارے[2] لیے اُن دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشمِ سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ مگر (نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے[3]۔

---

[1] خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

[2] یہ خطاب عام منکرین سے ہے جن میں اہلِ کتاب، مشرکینِ عرب اور منافقین سب شامل ہیں۔

[3] جنگِ بدر کا واقعہ اُس وقت قریبی زمانہ ہی میں پیش آچکا تھا اس لیے اس کے مشاہدات و نتائج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اس جنگ میں تین باتیں نہایت سبق آموز تھیں:۔

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے اس سے دونوں کا اخلاقی فرق صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دَور چل رہے تھے، ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں، اور خوب داد عیش دی جا رہی تھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں پرہیزگاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجہ کا اخلاقی انضباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے، بات بات پر خدا کا نام تھا اور خدا ہی کے آگے دعائیں اور التجائیں تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی قلتِ تعداد اور بے سرو سامانی کے باوجود کفار کی بڑی اور بہتر اسلحہ رکھنے والی

(باقی اگلے صفحہ پر)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو، میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی، اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویہ پر گہری نظر رکھتا ہے[۱]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ "مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے۔" یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں[۲]، راستباز، فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے[۵۳]، اور فرشتے

(بقیہ صفحہ سابق) فوج کے مقابلہ میں جس طرح کامیاب ہوئے اس سے صاف معلوم ہوگیا تھا کہ ان کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی غالب طاقت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سر و سامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پھولے ہوئے تھے ان کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلاش غریب الوطن مہاجروں اور مدینہ کے کاشتکاروں کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ذریعہ سے قریش جیسے قبیلہ کو شکست دلوا سکتا ہے جو تمام عرب کا سرتاج تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی اللہ غلط بخش نہیں ہے، نہ سرسری اور سطحی طور پر فیصلہ کرنے والا ہے، بلکہ بندوں کے اعمال و افعال اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو خوب جانتا ہے اور اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں میں سے کون اس انعام کا واقعی مستحق ہے۔

[۲] یعنی راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں، کسی نقصان یا مصیبت سے ہمت نہیں ہارتے، کسی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں[۱۵] کہ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے[۱۶]۔ اِس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے جنھیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرزِ عمل

(بقیہ صفحہ سابق) ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتے، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتے، اور ایسی حالت میں بھی حق کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں جبکہ بظاہر اُس حق کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔

[۱۳] یعنی اللہ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اُس کی شہادت ہے ـــــ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی ـــــ کہ پورے عالمِ وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو الوہیت کی صفات سے متصف ہو، الوہیت کے اقتدار کی مالک ہو، اور الوہیت کے حقوق کی مستحق ہو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱۴] اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے کیونکہ وہ سلطنتِ کائنات کے انتظامی اہلکار ہیں، اور وہ براہِ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رجوع کرتے ہوں۔ اس کے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہوا ہے اُن سب کی ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ متفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا مالک و مدبّر ہے۔

[۱۵] یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و درست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کردے، اور اس کی بندگی بجا لانے کا طریقہ خود ایجاد کرے بلکہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے، ہر کمی بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیت کے لیے اسلام کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریت سے لے کر شرک و بت پرستی تک ہر نظریے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حقدار سمجھ سکتا ہے، مگر فرمانروائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے۔

کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔[1] اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو ان سے کہو "میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے"۔[2] پھر اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب دونوں سے پوچھو کیا تم نے بھی اُس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟ اگر کی تو وہ راہِ راست پا گئے، اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملہ کو دیکھنے والا ہے۔

ع

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلقِ خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔[3] یہ وہ لوگ ہیں جن کے

[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوعِ انسانی میں رائج کیے گئے ان کی پیدائش کا سبب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیاز حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اصول اور احکام میں ردوبدل کر ڈالا۔

[2] دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ "میں اور میرے پیرو تو اُس ٹھیٹھ اسلام کے قائل ہیں جو خدا کا اصل دین ہے۔ اب تم بتاؤ کہ آیا تم اپنے اور اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو؟

[3] یہ طنزیہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں انھیں بتا دو کہ تمھارے اِن اعمال کا انجام یہ ہے۔

اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہوگئے، اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے۔[۵۱]

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے اُن کا حال کیا ہے؟ اُنھیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے[۵۲] تو اُن میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اِس فیصلہ کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز۔[۵۳] اُن کے خود ساختہ عقیدوں نے اُن کو اپنے دین کے معاملہ میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی اُن پر جب ہم انھیں اُس روز جمع کریں گے

---

[۵۱] "اُن کے اعمال ضائع ہوگئے" یعنی ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا، انھوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صرف کر دیں جس کا نتیجہ دنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔ اور "ان کا کوئی مددگار نہیں" یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان کی اس غلط سعی و عمل کو بہتر بنا سکے، یا کم از کم بد انجامی ہی سے بچا سکے جن جن قوتوں پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کے کام آئیں گی ان میں سے فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی۔

[۵۲] یعنی اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کو آخری سند مان لو، اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دو، اور جو کچھ اُس کی رو سے حق ثابت ہو اُسے حق اور جو اس کی رو سے باطل ثابت ہو اُسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد توراۃ یا انجیل ہے اور "کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ پانے والوں" سے مراد یہود و نصاریٰ کے علما ہیں۔

[۵۳] یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال جنت ہماری ہے، ہم اہلِ ایمان ہیں، ہم فلاں کی اُمت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے۔ اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، پھر سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کھلم کھلا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔

جس کا آنا یقینی ہے! اُس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو، اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔[1]

مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہمساز ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ،[2] مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اُسی کی طرف پلٹ کر

---

[1] جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتوت دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پھل پھول رہے ہیں، ایک طرف اہلِ ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور دوسری طرف ان کو اس فقر و فاقہ اور ان مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام سنہ اور اس کے لگ بھگ زمانہ میں مبتلا تھے، تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز استفہام گردش کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اُسی استفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرایہ میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

[2] یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہو اور اُسے اُن کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اسکو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انہی میں کا ایک آدمی ہے، یا اگر اس کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رویہ کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ شدید خوف کی حالت میں، جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

جانتا ہے۔ اے نبی، لوگوں کو خبردار کردو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اُسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ بہرحال اُسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اُس سے بہت دور ہوتا! اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔[۲]

اے نبی، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اُن سے کہو کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرلو"۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور

---

[۱] یعنی کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمہاری دنیا بگاڑ سکتے ہیں مگر خدا تمھیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑ جائے تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تمہاری جان و مال کا تحفظ ہو جائے اور کفر یا کافروں کی کوئی حقیقی خدمت تمہارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلہ میں کفر کو فروغ حاصل ہونے کا امکان ہو۔ ورنہ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو یا اہلِ ایمان کی جماعت کو یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا، یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی تو اللہ کے محاسبے سے ہرگز نہ بچ سکوگے۔ جانا تم کو بہرحال اُسی کے پاس ہے۔

[۲] یعنی یہ اس کی انتہائی خیر خواہی ہے کہ وہ تمھیں قبل از وقت ایسے اعمال پر متنبہ کر رہا ہے جو تمھارے انجام کی خرابی کے موجب ہو سکتے ہیں۔

اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں[۵۹]۔

اللہ[۶۰] نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران[۶۱] کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلہ کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۶۲]۔ (وہ اس وقت سن رہا تھا) جب عمران کی

---

[۵۹] یہاں پہلی تقریر ختم ہوتی ہے۔ اس کے مضمون، خصوصاً جنگِ بدر کی طرف جو اشارہ اس میں کیا گیا ہے اس کے انداز پر غور کرنے سے غالب قیاس یہی ہوتا ہے کہ اس تقریر کے نزول کا زمانہ جنگِ بدر کے بعد اور جنگِ اُحد سے پہلے کا ہے، یعنی ۳ھ ہجری۔ محمد بن اسحاق کی روایت سے عموماً لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس سورۃ کی ابتدائی ۸۰ آیتیں وفد نجران کی آمد کے موقع پر ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی تھیں لیکن اول تو اس تمہیدی تقریر کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ اس سے بہت پہلے نازل ہوئی ہوگی، دوسرے مقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفد نجران کی آمد پر صرف وہ آیات نازل ہوئی ہیں جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بیان پر مشتمل ہیں اور جن کی تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔

[۶۰] یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے جس کے نزول کا زمانہ ۹ھ ہجری ہے جب کہ نجران کی عیسائی جمہوریت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اُس وقت اس علاقہ میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیر حکم تھی۔ ایک عاقب کہلاتا تھا جس کی حیثیت امیر قوم کی تھی، دوسرا سید کہلاتا تھا جو ان کے تمدنی و سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا، اور تیسرا اسقف تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور تمام اہل عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں نجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینہ پہنچے۔ جنگ کے لیے بہرحال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذِمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے وفد نجران کو اسلام کی طرف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

عورت[۱] کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا، میری اس پیش کش کو قبول فرما، تو سننے اور جاننے والا ہے"[۲] پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے"۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو اس کی خبر تھی ــ "اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا[۳]۔ خیر، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں"۔ آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرما لیا، اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا، اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنا دیا۔

(بقیہ سابق) دعوت دی جائے۔

[۱] حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا اور آل عمران سے مراد وہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو حضرت موسیٰ و ہارون سے لے کر حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ تک پیدا ہوئے۔

[۲] مسیحوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ مسیح کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور الوہیت میں اُس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بنیادی غلطی رفع ہو جائے تو اسلام صحیح و خالص کی طرف ان کا پلٹنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر خطبہ کی تمہید یوں اُٹھائی گئی ہے کہ آدم اور نوح اور نسل ابراہیم و نسل عمرانی کے سب پیغمبر انسان تھے، ایک کی نسل سے دوسرا پیدا ہوتا چلا آیا، ان میں سے کوئی الٰہ نہ تھا، بس ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ نے اپنے دین کی تبلیغ اور دنیا کی اصلاح کے لیے ان کو منتخب فرمایا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریم کے والد تھے اور ان کا نام بھی عمران تھا۔ اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے تو دونوں جگہ عمران سے دو الگ شخصیتیں مراد لینے کی ضرورت نہ رہے گی۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر دونوں معنوں میں سے ایک کو ترجیح دے سکیں کیونکہ اس کا انحصار یہ ثابت ہو جانے پر ہے کہ حضرت مریم کے والد کا نام واقعی عمران تھا، یا نہیں تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب[۵] میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب سے پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر، تو ہی دعا سننے والا ہے"[۶]۔ جواب میں فرشتوں نے آواز دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان[۷] کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی،

(بقیہ سابق) [۳] یعنی تو اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی نیتوں کے حال سے واقف ہے۔

[۴] یعنی لڑکا ان بہت سی فطری کمزوریوں اور تمدنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو وہ مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵] اب اُس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریم سنِ رشد کو پہنچ گئیں اور بیت المقدس کی عبادتگاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔

لفظ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اُس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطحِ زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام، اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔

[۶] حضرت زکریا اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرۃً ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش اللہ انھیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کرے، اور یہ دیکھ کر کہ اللہ کس طرح اپنی قدرت سے اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق پہنچا رہا ہے انھیں یہ امید ہوئی کہ اللہ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی اُن کو اولاد دے سکتا ہے۔

[۷] اللہ کے فرمان سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش (باقی اگلے صفحہ پر)

کمال درجہ کا ضابط ہوگا، نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا"۔ زکریا نے کہا "پروردگار بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے"۔ جواب ملا "ایسا ہی ہوگا،[1] اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ عرض کیا "مالک! پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے"۔[2] کہا "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا"۔[3]

پھر وہ وقت آیا جب مریم سے فرشتوں نے آکر کہا "اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریم اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک"۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعے

(بقیہ سابق) اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرقِ عادت کے طور پر ہوئی تھی اس لیے ان کو قرآن مجید میں "کلمۃ من اللہ" کہا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی تیرے بڑھاپے اور تیرے بانجھ پن کے باوجود اللہ تجھے بیٹا دے گا۔

[2] یعنی ایسی علامت بتا دے کہ جب ایک پیرِ فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اطلاع مجھے پہلے سے ہو جائے۔

[3] اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر اُن کے اس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ بیچ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام کی ولادت معجزانہ طریقہ سے ہوئی تھی اسی طرح اُن سے چھ مہینہ پہلے ہی حضرت یحییٰ کی پیدائش بھی ایک دوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی اس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحییٰ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیح محض اپنی غیر معمولی پیدائش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے۔ اور نہ تم اُس وقت حاضر تھے جب اُن کے درمیان جھگڑا برپا تھا ــــ اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا"۔ یہ سُن کر مریم بولی "پروردگار! میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا"۔ جواب ملا "ایسا ہی ہوگا[1]، اللہ

[1] یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا تیرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کذالک (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریا کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنی کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریم کے ہاں اُسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے اور اگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش فی الواقع اسی طرح ہوئی ہوتی تو یہ سارا بیان قطعی مہمل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے ہیں جو ولادت مسیح کے باب میں دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو الٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے مانا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی اور یہودیوں نے حضرت مریم پر تہمت اسی وجہ سے لگائی تھی کہ علانیہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ ہے اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی ہو جاتا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اُسی کے نطفے سے عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دو لوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اُٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت (باقی اگلے صفحہ پر)

جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے"۔ (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا) "اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا۔ توراۃ اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔ (اور وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل سے کہے گا کہ) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر سکتا ہوں اور مردے کو زندہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو[۵۱]۔ اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں سے اِس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے[۵۲] اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو

(بقیہ صفحۂ سابق) کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہارِ مافی الضمیر اور بیانِ مدعا کی اُتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں (معاذ اللہ)۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اُس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکم ذی اقتدار ہے، بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو، ہٹ دھرمی نہ ہو۔

[۵۲] یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور پر تمہیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اُسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔[۱] دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی اُس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔[۲]"

جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ[۳] بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟" حواریوں[۴] نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں،[۵] ہم اللہ

---

[۱] یعنی تمہارے جہلا کے توہمات، تمہارے فقیہوں کی قانونی موشگافیوں، تمہارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشددات، اور غیر مسلم قوموں کے غلبہ و تسلط سے تمہارے ہاں اصل شریعتِ الٰہی پر جن قیود کا اضافہ ہو گیا ہے ان کو منسوخ کر دوں اور تمہارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

[۲] تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے: ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویّہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کے خوف پر اخلاق و تمدن کا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے، دوسرے یہ کہ اس مقتدرِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے، تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔ پس درحقیقت حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ رعایا کو نافرمانی، خود مختاری اور شرک (یعنی اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھیرانے اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کرنے) سے منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

[۳] حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لے کر ان کے جوان ہونے اور نبوت کا کام عملاً شروع کر دینے تک کے تمام واقعات بیچ میں چھوڑ کر اب اس وقت کا ذکر شروع کیا جاتا ہے جب بنی اسرائیل میں اُن کی (باقی اگلے صفحہ پر)

پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والے) ہیں، مالک! جو فرمان تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے"۔

پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے، جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے[۵۲]۔ (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اُس نے کہا کہ "اے عیسیٰ اب میں تجھے واپس لے لوں گا[۵۳] اور تجھ کو اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور

(بقیہ سابق) مخالفت شروع ہوئی۔

۵۰ "حواری" کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں "انصار" کا مفہوم ہے۔

۵۱ دینِ اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "اللہ کی مدد کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا بلکہ اسے دلیل اور نصیحت سے اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے، اور جو بندے اس کام میں اللہ کے ساتھ شریک ہوں ان کو اللہ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے، اور یہ وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے، مگر تبلیغ دین اور اقامتِ دین کی جد و جہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۳ اصل میں لفظ "متوفیک" استعمال ہوا ہے۔ توفی کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں۔ "روح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے نہ کہ اصل معنی موضوع لہ۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (To recall) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے (ان کی معیت سے اور ان کے گندے ماحول میں ان کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک اُن لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے، پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے

(بقیۂ سابق) صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور ہر اُس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انھیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قربان کر دیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیت مسیح کی تردید و اصلاح کے لیے ہے، اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کا اہم ترین سبب حضرت مسیح کی اعجازی ولادت اور ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات کے بعد اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا ہے جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر عیسائیوں کی یہ روایت غلط ہوتی تو ان کے عقیدہ الوہیت کا اس سے بہتر کوئی رد نہ ہو سکتا تھا کہ ان سے صاف الفاظ میں کہا جاتا کہ جسے تم اِلٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فلاں مقام پر جا کر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور جنھوں نے ایمان اور نیک عملی کا رویہ اختیار کیا ہے انھیں اُن کے اجر پورے پورے دیدیے جائیں گے۔ اور خوب جان لے کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اُسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا[۱] یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں[۲]۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملہ میں تم سے

(بقیہ سابق) اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیح سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں ایلی ایلی لما شبقتانی کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا، مسیح کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اٹھا لیا تھا۔ اس پر بھی جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

[۱] انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انھوں نے اُسے رد کر دیا تھا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں تک کی تقریر میں جو بنیادی نکات عیسائیوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ علی الترتیب حسب ذیل ہے:

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمھارے لئے

(باقی اگلے صفحہ پر)

جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو"۔ یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظامِ عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اس شرط پر مقابلہ میں آنے سے) منہ موڑیں تو

(بقیہ سابق) جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اٹھا لے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا ملکیت میں اُس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اُس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵؎ فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفدِ نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا جواب بھی اُن لوگوں کے پاس نہ تھا۔ او مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتبِ مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے بھی قائل ہو چکے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے، اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو (باقی اگلے صفحہ پر)

(اُن کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔

کہو،[۱] اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے،[۲] یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے ۔۔۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں ۔۔۔

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ توراۃ اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں، پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے[۳] ۔۔۔ تم لوگ جن

(بقیہ سابق) کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا اور یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکّہ دور دور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جس کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ بدر اور جنگ اُحد کے درمیانی دَور کی ہے۔ لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سورۃ سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربط کلام ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر بعض مفسرین کو شبہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفد نجران والی تقریر ہی کے سلسلہ کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مخاطب یہودی ہیں۔

[۲] یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمھارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمھاری اپنی کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

[۳] یعنی تمھاری یہ یہودیت اور یہ نصرانیت بہرحال توراۃ اور انجیل کے نزول کے بعد پیدا ہوئی ہیں اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب اُن معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ سیدھا[1] مسلم تھا اور شرک کرنے والوں میں ہرگز نہ تھا۔" ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اُس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اِس کے ماننے والے اِس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔

(اے ایمان لانے والو!) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمھیں راہِ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو[2]؟ اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟

(بقیہ سابق) ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گذر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے وہ بہرحال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا، پھر اگر حضرت ابراہیم راہِ راست پر تھے اور نجات یافتہ تھے تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہِ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیت و نصرانیت کی پیروی پر موقوف نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اصل میں لفظ حنیف استعمال ہوا ہے جس سے مراد ایسا شخص ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر یکسوئی کے ساتھ سیدھی راہ پر چلے۔

[2] دوسرا ترجمہ اس فقرہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم خود گواہی دیتے ہو"۔ دونوں صورتوں میں نفس معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات، اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہوتے تھے، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو گروہ انبیاء کے احوال اور کتبِ آسمانی کے طرز سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرت کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں[1]۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔ اے نبی ان سے کہدو کہ "اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اُسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دیدیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا، یا یہ کہ دوسروں کو تمھارے رب کے حضور پیش کرنے کے لیے تمھارے خلاف قوی حجت مل جائے"۔ اے نبی ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر[2] ہے اور سب کچھ جانتا ہے[3]، اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے"۔

(بقیہ سابق) نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب (خصوصاً ان کے اہلِ علم) یہ جان چکے تھے کہ حضور وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیاء سابقین نے کیا تھا، حتیٰ کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپ کی صداقت اور آپ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کر گزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودی قبائل کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا تاکہ پہلے علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور اُن کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں۔

[2] اصل میں لفظ "واسع" استعمال ہوا ہے جو بالعموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقع جہاں

(باقی اگلے صفحہ پر)

اہل کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمھارا مال تمھیں ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ اُن کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں" امیوں (غیر یہودی عربوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے[۵۱]"۔ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں اُن سے بازپرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ اُن سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا[۵۲]، بلکہ اُن

(بقیہ سابق) انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اُسے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمھاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمھاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیت منسوب کرتے ہیں اور انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔

۵۰ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کون فضل و شرف کا مستحق ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ یعنی امانت اور دیانت کا لحاظ صرف یہودیوں سے معاملہ کرنے میں ہونا چاہیے، غیر یہودی کا مال اگر مار لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ عجب نہیں کہ کارِ ثواب ہو۔

۵۲ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز بس یہی اللہ کے مقرب بندے ہوں گے، انہی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی، ... تھوڑا بہت

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔[1] وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی[2] بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنا لو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمھیں کفر کا

(بقیہ سابق) گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھو ڈالا جائیگا حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو اُن کے مفاد یا اُن کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب میں بھی مفقود نہیں ہیں۔ مثلاً بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں اِنَّمَا کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "اے نبی کہدو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا"۔

[2] یہودیوں کے ہاں جو علماء مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی امور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکام دین کا اجراء کرنا ہوتا تھا، ان کے لیے لفظ ربانی استعمال کیا جاتا تھا جیسا خود قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ

(باقی اگلے صفحہ پر)

حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟[۶۹]

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔[۷۰] یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اُٹھاتے ہو؟" انھوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔[۷۱]"

(بقیہ حاشیہ سابق) اَکْلِهِمُ السُّحْتَ (ان کے ربانی اور ان کے علما ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے) اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (Divine.) بھی "ربانی" کا ہی ہم معنی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۶۹؎ یہ اُن تمام غلط باتوں کی ایک جامع تردید ہے جو دنیا کی مختلف قوموں نے خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی رو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبود قرار پاتا ہے۔ ان آیات میں یہ قاعدۂ کلیہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

۷۰؎ مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ۔۔۔ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ اس کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ۔۔۔ کہ جو نبی ہماری طرف سے اس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمھیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصب

(باقی اگلے صفحہ پر)

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اُسی کی تابع فرمان (مسلم) ہیںؑ اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبی کہو کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔ ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں، اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتےعلیہ اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں"۔ اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

(بقیہ سابق) نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مخالفت نہ کرنا، بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

سلہ اس ارشاد سے مقصود اہل کتاب کو متنبہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور ان کی مخالفت کر کے اس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمہارے انبیاء سے لیا گیا تھا، لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کونسا طریقہ زندگی (باقی صفحہ آئندہ پر)

کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمت ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول حق پر ہے اور روشن نشانیاں لیکر آیا ہے[۱]؟ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ اُن پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے۔ اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔ البتہ وہ لوگ اس سے بچ جائیں گے جو توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے اس کفر میں بڑھتے چلے گئے[۲] ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے روئے زمین بھر کر بھی سونا فدیہ میں دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔

(بقیہ سابق) تلاش کر رہے ہو۔

۵۵ یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں کسی کو جھوٹا کہیں اور کسی کو سچا۔ ہم تعصب اور حمیتِ جاہلیہ سے پاک ہیں۔ دنیا میں جہاں جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ہم اس کے برحق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ یہاں پھر اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے قبل بارہا بیان کی جا چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کے یہودی علماء جان چکے تھے اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپ نبی برحق ہیں اور جو تعلیم آپ لائے ہیں وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا وہ محض تعصب، ضد اور دشمنی حق کی اس پرانی عادت کا نتیجہ تھا جس کے وہ صدیوں سے مجرم چلے آ رہے تھے۔

۲ یعنی صرف انکار ہی پر بس نہ کی بلکہ عملاً مخالفت و مزاحمت بھی کی، لوگوں کو خدا کے راستہ سے روکنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگا یا، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں، دلوں میں وسوسے ڈالے، اور ایسی سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں کہ نبی کا مشن کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔

مقالات

اسلام میں مُرتد کا حکم

کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغِ کفر کی اجازت ہے؟

"کیا اسلام نے مرتد کی سزا قتل قرار دی ہے؟ قرآن سے اس کا کیا ثبوت ملتا ہے؟ اگر قرآن سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے تو احادیث وسنت سے کہاں تک اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے؟ نیز حضرت ابوبکر کے قتالِ مرتدین کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ عقلی حیثیت سے قتلِ مرتدین کا جواز کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟

کیا ایک صحیح اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق اسی طرح حاصل ہوگا جس طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہیے؟ کیا خلافتِ راشدہ اور بعد کی خلافتوں کے تحت کفار و اہلِ کتاب کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق حاصل تھا؟ قرآن وسنت اور عقلی حیثیت سے اس کے عدمِ جواز کا کہاں تک ثبوت ملتا ہے؟

ان دونوں امور کے متعلق میں نے بہت غور کیا مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ خلاف اور موافق دونوں دلائل وزن رکھتے ہیں اور قرآن وسنت میں ان امور کی بابت کوئی خاص تصریح نہیں ملتی، کم از کم جہاں تک میرا محدود علم رسائی کرتا ہے۔ اگر اس کا جواب ترجمان القرآن میں شائع ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ میرے سوا بہت سے لوگ اس بحث سے دلچسپی رکھتے ہیں۔"

یہ ایک دوست کے خط کا اقتباس ہے جنھیں اسلام کے نظامِ تمدن وسیاست سے خاص دلچسپی ہے اور اکثر اس سلسلہ میں مسائل کی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔

ان سوالات میں تنقیح طلب امور صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ قتل مرتد اور کفار کی تبلیغ کے باب میں اسلام کے واقعی احکام کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس کیا دلائل ہیں جن سے ہم ان احکام کی معقولیت پر خود مطمئن ہیں اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔

۱۔ مسئلہ قتل مرتد شرعی حیثیت سے جہاں تک پہلی تنقیح کا تعلق ہے، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ اسلام میں ایسے شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ اس باب میں پہلا شک جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی عیسوی کے دور آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا، ورنہ اس سے پہلے کامل بارہ سو برس تک یہ تمام امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے اور ہمارا پورا دینی لٹریچر شاہد ہے کہ قتل مرتد کے معاملہ میں مسلمانوں کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں پائی گئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابۂ کبار، تابعین، ائمۂ مجتہدین، اور ان کے بعد ہر صدی کے علمائے شریعت کی تصریحات کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے دیکھ لیجیے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ دور نبوت سے لے کر آج تک اس مسئلہ میں ایک ہی حکم مسلسل و متواتر چلا آ رہا ہے اور کہیں اس شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی کہ شاید مرتد کی سزا قتل نہ ہو۔ ایسے ثابت شدہ مسائل کے متعلق جن لوگوں نے موجودہ زمانہ کی نام نہاد روشن خیالی سے متاثر ہو کر اختلافی بحث کا دروازہ کھولا اُن کی جسارت فی الواقع سخت حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر ایسے امور بھی مشکوک ہو جائیں جن کے لیے اس قدر تسلسل اور تواتر کے ساتھ شہادتیں پائی جاتی ہیں تو معاملہ ایک دو مسائل تک محدود کہاں رہتا ہے۔ اس کے بعد تو زمانہ گذشتہ کی کوئی چیز بھی جو ہم تک روایۃً پہنچی ہے شک سے محفوظ نہیں رہتی، خواہ وہ قرآن ہو یا نماز یا روزہ، بلکہ سرے سے یہی بات مشکوک ہو جاتی ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی دنیا میں مبعوث بھی ہوئے تھے یا نہیں۔ اس قسم کے شکوک پیدا کرنے کے بجائے درحقیقت اُن کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ واقعہ ہے اور مستند شہادتوں

سے ثابت ہے اسے واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے اور پھر غور اس امر پر کرتے کہ آیا ہم اُس دین کا اتباع کریں یا نہ کریں جو مرتد کو موت کی سزا دیتا ہے۔ اپنے مذہب کی کسی ثابت و مسلّم چیز کو اپنے عقلی معیاروں کے خلاف پا کر جو شخص یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ چیز اس مذہب میں سے ہی نہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ "کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو" کی حالت میں مبتلا ہے۔ یعنی اس کا طریقِ فکر و نظر جس مذہب کے حقیقی راستہ سے منحرف ہو چکا ہے، اس میں رہنے پر وہ صرف اس لیے اصرار کر رہا ہے کہ وہ مذہب اس نے باپ دادا سے پایا ہے۔

حکمِ قتلِ مرتد کا ثبوت ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو اور بعد کے مولویوں نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو ان کو اطمینان دلانے کے لیے میں یہاں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من بدل دینہ فاقتلوہ	جو شخص (یعنی مسلمان) اپنا دین بدل دے اُسے قتل کر دو

یہ حدیث حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت خالد بن ولید اور متعدد دوسرے صحابہ سے مروی ہے اور تمام معتبر کتب حدیث میں موجود ہے۔ اس کی مزید تائید حسب ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل دم امرء مسلم یشہد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلث: النفس بالنفس، والثیب الزانی، والمفارق لدینہ التارک للجماعۃ (بخاری، کتاب الدیات۔ مسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمان ہو اور اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون تین جرائم کے سوا کسی صورت میں حلال نہیں، ایک یہ کہ اس نے کسی کی جان لی ہو اور قصاص کا مستحق ہو گیا ہو، دوسرے یہ کہ وہ شادی شدہ ہو

اور زنا کرے، تیسرے یہ کہ اپنے دین کو چھوڑ دے اور جماعت سے الگ ہو جائے۔

۲۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یحل دم امرء مسلم الا رجل زنی بعد احصانہ او کفر بعد اسلامہ او النفس بالنفس (نسائی، باب ذکر ما یحل بہ دم المسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں الّا یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کی ہو، یا مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کیا ہو، یا کسی کی جان لی ہو۔

۳۔ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یحل دم امرء مسلم الا باحدی ثلث، رجل کفر بعد اسلامہ او زنی بعد احصانہ او قتل نفساً بغیر نفس (نسائی، باب القود)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے بجز تین صورتوں کے، ایک یہ کہ کوئی شخص اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا ہو، دوسرے یہ کہ شادی شدہ ہونے کے بعد اس نے زنا کی ہو تیسرے یہ کہ وہ قتل کا مرتکب ہو بغیر اس کے کہ اسے جان کے بدلے جان لینے کا حق حاصل ہوا ہو۔

حضرت عثمانؓ ہی سے دوسری روایت یہ ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یحل دم امرء مسلم الا باحدی ثلث رجل زنی بعد احصانہ فعلیہ الرجم او قتل عمداً فعلیہ القود او ارتد بعد اسلامہ فعلیہ القتل۔

(نسائی، باب الحکم فی المرتد)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین جرائم کی پاداش میں، ایک یہ کہ کسی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کی ہو، اس کی سزا سنگساری ہے، دوسرے یہ کہ کسی نے عمداً قتل کا ارتکاب کیا ہو، اس پر قصاص ہے، تیسرے یہ کہ کوئی اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا ہو، اس کی سزا قتل ہے۔

تاریخ کی تمام معتبر کتابوں سے ثابت ہے کہ یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر ہزاروں آدمیوں کے سامنے اس وقت بیان کی تھی جب کہ باغی آپ کے مکان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور آپ کے قتل کے درپے تھے۔ اگر یہ امر ذرہ برابر بھی مشتبہ ہوتا کہ آیا یہ فرمانِ نبوی ہے یا نہیں، تو سینکڑوں آوازیں بلند ہو جاتیں کہ آپ کا بیان غلط ہے یا مشکوک ہے۔

۴۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثہٗ الی الیمن ثم ارسل معاذ بن جبل بعد ذالك فلما قدم قال ایھا الناس انی رسولُ رسولِ اللہ الیکم فالقیٰ لہ ابو موسیٰ وسادۃً لیجلس علیھا فاتی رجل کان یہودیاً فاسلم ثم کفر فقال معاذ لا اجلس حتی یقتل قضاءُ اللہِ ورسولِہ ثلث مرات فلما قتل قعد (نسائی باب حکم المرتد۔ بخاری باب حکم المرتد والمرتدوا استتابتھم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو (یعنی حضرت ابو موسیٰ کو) یمن کا حاکم مقرر کر کے بھیجا پھر اس کے بعد معاذ بن جبل کو ان کے معاون کی حیثیت سے روانہ کیا جب معاذ وہاں پہنچے تو انھوں نے اعلان کیا کہ لوگو! میں تمھاری طرف اللہ کے رسول کا فرستادہ ہوں۔ ابو موسیٰ نے ان کے لیے تکیہ رکھا تاکہ اس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں۔ اتنے میں ایک شخص پیش ہوا جو پہلے یہودی تھا پھر مسلمان ہوا پھر یہودی ہو گیا۔ معاذ نے کہا میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک یہ شخص قتل نہ کر دیا جائے، اللہ اور اس کے رسول کا یہی فیصلہ ہے معاذ نے یہ بات تین دفعہ کہی۔ آخرکار جب وہ قتل کر دیا گیا تو معاذ بیٹھ گئے۔

خیال رہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں پیش آیا۔ اس وقت حضرت ابو موسیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنر کی حیثیت میں اور حضرت معاذ وائس گورنر کی حیثیت میں تھے۔ اگر ان کا یہ فعل واقعی اللہ اور رسول کے فیصلہ پر مبنی نہ ہوتا تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پر

باز پرس فرماتے۔

خلافت راشدہ کے نظائر اس کے بعد دورِ خلافتِ راشدہ کے نظائر ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ایک عورت جس کا نام ام فرقہ تھا اسلام لانے کے بعد کافر ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا، مگر اس نے توبہ نہ کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے قتل کرا دیا۔ (کنز العمال و نیل الاوطار)

(۲) عمرو ابن عاص حاکم مصر نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ایک شخص اسلام لایا تھا، پھر کافر ہوگیا، پھر اسلام لایا پھر کافر ہوگیا، یہ فعل وہ کئی مرتبہ کر چکا ہے۔ اب اس کا اسلام قبول کیا جائے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جب تک اللہ اس سے اسلام قبول کرتا ہے تم بھی کیے جاؤ، اس کے سامنے اسلام پیش کرو، مان لے تو چھوڑ دو ورنہ گردن مار دو (کنز العمال)

(۳) سعد بن ابی وقاص اور ابوموسیٰ اشعری نے تستر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس ایک قاصد بھیجا۔ قاصد نے حضرت عمرؓ کے سامنے حالات کی رپورٹ پیش کی۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے پوچھا کوئی اور غیر معمولی بات؟ اس نے عرض کیا ہاں اے امیر المومنین! ہم نے ایک عرب کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہوگیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا پھر تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا ہم نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ اسے ایک کمرے میں بند کر کے دروازہ کا تیغہ لگا دیتے، پھر تین دن تک روزانہ ایک روٹی اس کے پاس پھینکتے رہتے۔ شاید کہ وہ اس دوران میں توبہ کر لیتا۔ خدایا یہ کام میرے حکم سے نہیں ہوا، نہ میرے سامنے ہوا، نہ میں اسے سن کر راضی ہوا"۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر حضرت سعد اور ابوموسیٰ اشعری سے کوئی باز پرس نہیں کی اور نہ کوئی سزا تجویز کی (طحاوی، کتاب السیر، بحث استتابۃ المرتد)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعد اور ابوموسیٰ کا فعل تھا تو قانون کی حدود کے اندر لیکن

حضرت عمر کی رائے میں اس شخص کو توبہ کا موقع دینا احسن تھا۔

(۴) حضرت عبداللہ ابن مسعود کو اطلاع ملی کہ بنی حنیفہ کی ایک مسجد میں کچھ لوگ شہادت دے رہے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ نے پولیس بھیجی اور ان کو گرفتار کرکے بلا لیا۔ جب وہ لوگ ان کے سامنے پیش ہوئے تو سب نے توبہ کرلی اور اقرار کیا کہ ہم آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ نے اوروں کو تو چھوڑ دیا مگر ان میں سے ایک شخص عبداللہ ابن النواحہ کو موت کی سزا دی۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ نے ایک ہی مقدمہ میں دو مختلف فیصلے کیے۔ حضرت عبداللہ نے جواب دیا کہ یہ ابن النواحہ وہ شخص ہے جو مسیلمہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفیر بن کر آیا تھا۔ میں اس وقت حاضر تھا۔ ایک دوسرا شخص حجر بن وثال بھی اس کے ساتھ سفارت میں شریک تھا۔ آنحضرت نے ان دونوں سے پوچھا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ان دونوں نے جواب دیا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے؟ اس پر حضور نے فرمایا کہ اگر سفارتی وفد کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ یہ واقعہ بیان کرکے حضرت عبداللہ نے کہا میں نے اسی وجہ سے ابن النواحہ کو سزائے موت دی ہے (طحاوی حوالہ مذکور)

واضح رہے کہ یہ واقعہ حضرت عمر کے زمانہ کا ہے جب کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود اُن کے ماتحت کوفہ کے چیف جج تھے۔

(۵) کوفہ میں چند آدمی پکڑے گئے جو مسیلمہ کی دعوت پھیلا رہے تھے۔ حضرت عثمان کو اس باب میں لکھا گیا۔ آپ نے جواب میں لکھا ان کے سامنے دینِ حق اور شہادتِ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پیش کی جائے، جو اسے قبول کرے اور مسیلمہ سے برأت کا اظہار کردے اُسے چھوڑ دیا جائے اور جو دینِ مسیلمہ پر قائم رہے اسے قتل کر دیا جائے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۶) حضرت علی کے سامنے ایک شخص پیش کیا گیا جو پہلے عیسائی تھا، پھر مسلمان ہوا، پھر عیسائی ہوگیا۔ آپ نے اس سے پوچھا تیری اس روش کا کیا سبب ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے عیسائیوں کے دین کو تمھارے دین سے بہتر پایا۔ حضرت علی نے پوچھا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمھارا کیا عقیدہ ہے؟ اس نے کہا وہ میرے رب ہیں، یا یہ کہا کہ وہ علی کے رب ہیں۔ اس پر حضرت علی نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ (طحاوی۔ حوالہ مذکور)

(۷) حضرت علی کو اطلاع دی گئی کہ ایک گروہ عیسائی سے مسلمان ہوا پھر عیسائی ہوگیا۔ حضرت علی نے ان لوگوں کو گرفتار کرا کے اپنے سامنے بلوایا اور حقیقت حال دریافت کی۔ انھوں نے کہا ہم عیسائی تھے، پھر ہمیں اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں۔ ہم نے اسلام کو اختیار کر لیا، مگر اب ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے سابق دین سے افضل کوئی دین نہیں ہے لہٰذا اب ہم عیسائی ہیں۔ اس پر حضرت علی کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنا لیے گئے۔ (طحاوی۔ حوالہ مذکور)

(۸) حضرت علی کو اطلاع دی گئی کہ کچھ لوگ آپ کو اپنا رب قرار دیتے ہیں۔ آپ نے انھیں بلا کر پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا آپ ہمارے رب ہیں اور ہمارے خالق و رازق ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا، تمھاری حالت پر افسوس ہے، میں تو تم جیسا ایک بندہ ہوں، تمھاری طرح کھانا اور پیتا ہوں، اگر اللہ کی اطاعت کروں گا تو وہ مجھے اجر دے گا اور اس کی نافرمانی کروں تو مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے سزا دے گا۔ لہٰذا تم خدا سے ڈرو اور اپنے اس عقیدہ کو چھوڑ دو۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ دوسرے دن قنبر نے آکر عرض کیا کہ وہ لوگ پھر وہی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ نے انھیں بلا کر دریافت کیا اور انھوں نے وہی سب باتیں دہرا دیں۔ تیسرے روز حضرت علی نے انھیں بلا کر دھمکی دی کہ اگر اب تم نے وہ بات کہی تو میں تم کو بدترین طریقہ سے قتل کروں گا

مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار حضرت علی نے ایک گڑھا کھدوایا، اس میں آگ جلوائی، پھر ان سے کہا، دیکھو اب بھی اپنے اس قول سے باز آجاؤ ورنہ میں تمہیں اس گڑھے میں پھینک دوں گا۔ مگر وہ اپنے اسی عقیدے پر قائم رہے۔ تب حضرت علی کے حکم سے وہ سب اس گڑھے میں پھینک دیے گئے (فتح الباری، جلد ۱۲، صفحہ ۲۳۸)

(۹) حضرت علی رحبہ کے مقام پر تھے کہ آپ کو ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ یہاں ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں ایک بت رکھ چھوڑا ہے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بت نکل آیا۔ حضرت علی نے اس گھر میں آگ لگادی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا (فتح الباری جلد ۱۲، صفحہ ۲۳۹)

(۱۰) حضرت علی کے زمانہ میں ایک شخص پکڑا ہوا آیا جو مسلمان تھا پھر کافر ہو گیا۔ آپ نے اُسے ایک مہینہ تک توبہ کی مہلت دی، پھر اس سے پوچھا، مگر اس نے توبہ سے انکار کر دیا۔ آخر کار آپ نے اُسے قتل کرا دیا (کنز العمال جلد ۱، صفحہ ۸۱)

یہ دس نظیریں پورے دورِ خلافت راشدہ کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ چاروں خلفاء کے زمانہ میں جب بھی ارتداد کا واقعہ پیش آیا ہے اس کی سزا قتل ہی دی گئی ہے، اور ان میں سے کسی واقعہ میں بھی نفس ارتداد کے سوا کسی دوسرے جرم کی شمولیت ثابت نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ قتل کی سزا دراصل اُس جرم پر دی گئی تھی نہ کہ ارتداد پر۔

مرتدوں کے خلاف خلیفۂ اول کا جہاد مگر ان سب نظیروں سے بڑھ کر وزنی نظیر اہلِ ردۃ کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق کا جہاد ہے۔ اس میں صحابۂ کرام کی پوری جماعت شریک تھی۔ اس سے اگر ابتدا میں کسی نے اختلاف کیا بھی تھا تو بعد میں وہ اختلاف اتفاق سے بدل گیا تھا۔ لہٰذا یہ معاملہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے براہ راست نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے دین کی تعلیم و تربیت پائی تھی ان سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ جو گروہ اسلام سے پھر جائے اس کے خلاف اسلامی حکومت کو جنگ کرنی چاہیے۔

بعض لوگ اس جہاد کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ مرتدین کی حیثیت دراصل باغیوں کی تھی کیونکہ انھوں نے حکومت کا ٹیکس (یعنی زکوٰۃ) دینا بند کر دیا تھا اور وہ حکومت کے عاملوں کو الگ کر کے خود اپنی حکومتیں قائم کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ توجیہ چار وجوہ سے قطعی غلط ہے:

اولاً یہ جہاد جن لوگوں کے خلاف کیا گیا تھا وہ سارے کے سارے مانعینِ زکوٰۃ ہی نہیں تھے بلکہ ان میں مختلف قسم کے مرتدین شامل تھے۔ کچھ لوگ ان مدعیان نبوت پر ایمان لے آئے تھے جنھوں نے عرب کے مختلف گوشوں میں اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔ کچھ لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین نہ رہا تھا اور وہ کہتے تھے کہ لو کان محمدٌ نبیًا ما مات (اگر محمدؐ نبی ہوتے تو مرتے نہیں)۔ کچھ لوگ تمام ضروریاتِ دین کے قائل تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرنے کے لیے تیار تھے مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنی زکوٰۃ بطورِ خود جمع اور خرچ کریں گے، ابوبکرؓ کے عاملوں کو نہیں دیں گے۔ کچھ اور لوگ کہتے تھے:

اطعنا رسول اللہ اذ کان بیننا فواعجبا ما بال ملک ابی بکر

یعنی انھیں اس امر سے اختلاف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا نظام قائم ہو اور سب مسلمانوں کو اسی طرح اس مرکز سے وابستہ رہنے پر مجبور کیا جائے جس طرح وہ رسول اللہ کی شخصیت سے وابستہ تھے۔

ثانیاً، ان سب لوگوں کے لیے صحابہ نے باغی کے بجائے "مرتد" کا لفظ اور اس ہنگامے کے لیے بغاوت کے بجائے "ارتداد" کا لفظ استعمال کیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں وہ اصل جرم جس کے یہ لوگ مرتکب ہوئے تھے، ارتداد تھا نہ کہ بغاوت۔ جنوب عرب میں جن لوگوں نے لقیط

بن مالک الازدی کی نبوت تسلیم کر لی تھی ان کے خلاف حضرت ابوبکر نے عکرمہ بن ابی جہل کو جہاد کے لیے روانہ کرتے وقت یہ ہدایت کی تھی کہ ومن لقیتہ من المرتدۃ بین عمان الی حضرموت والیمن فنکل بہ (عمان سے حضرموت اور یمن تک جہاں مرتدوں کو پاؤ کچل ڈالو)۔

ثالثاً جن لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا ان کے معاملہ میں جب یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ آیا ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنا جائز بھی ہے یا نہیں تو حضرت ابوبکر نے جواب دیا تھا واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ (خدا کی قسم، جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا)۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیفۂ اول کی نگاہ میں اُن کا اصل جرم ٹیکس نہ دینا نہیں تھا بلکہ دینِ اسلام کے دو ارکان میں سے ایک کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا تھا۔ اور آخر کار جس بناء پر صحابۂ کرام نے ان مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے معاملہ میں خلیفہ سے اتفاق کیا وہ یہی تھی کہ خلیفۂ برحق کے دلائل سے انھیں اس امر کا پورا اطمینان ہو گیا کہ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرنے کی وجہ سے یہ لوگ دائرۂ دین سے باہر نکل چکے ہیں۔

رابعاً، ان سب سے بڑھ کر فیصلہ کن چیز سیدنا ابوبکر صدیق کا وہ فرمانِ عام (Proclamation) ہے جو آپ نے عرب کے مختلف گوشوں میں مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے ۱۱ فوجیں روانہ کرتے وقت ہر فوج کے کمانڈر کو لکھ کر دیا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ (جلد ۶ صفحہ ۳۱۶) میں یہ پورا فرمان نقل کیا ہے۔ اس کے حسب ذیل فقرے خاص طور پر قابلِ غور ہیں:

"تم میں سے جن لوگوں نے شیطان کی پیروی قبول کی ہے اور جو اللہ سے بے خوف ہو کر اسلام سے کفر کی طرف پھر گئے ہیں ان کی اس حرکت کا حال مجھے معلوم ہوا ...... اب میں نے فلاں شخص کو مہاجرین و انصار اور نیک نہاد تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا ہے اور اسے ہدایت کر دی ہے کہ ایمان کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے۔ اور

اللہ عزوجل کی طرف دعوت دیئے بغیر کسی کو قتل نہ کرے۔ پس جو کوئی اس کی دعوت الی اللہ کو قبول کرے گا اور اقرار کرنے کے بعد اپنا عمل درست رکھے گا اس کے اقرار کو وہ قبول کرلے گا اور اُسے راہِ راست پر چلنے میں مدد دے گا اور جو انکار کرے گا اس سے وہ لڑے گا یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اس کو حکم دے دیا گیا ہے کہ انکار کرنے والوں میں سے جس پر وہ قابو پائے اسے جیتا نہ چھوڑے، ان کی بستیوں کو جلا دے، ان کو نیست و نابود کر دے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے اور اسلام کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے۔ پس جو اس کی بات مان لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا۔ میں نے اپنے فرستادہ امیر کو یہ بھی ہدایت کر دی ہے کہ میری اس تجویز کو تمہارے ہر مجمع میں سنا دے۔ اور یہ کہ اسلام قبول کرنے کی علامت اذان ہے، جہاں سے اذان کی آواز آئے اس بستی سے تعرض نہ کرو اور جہاں سے یہ آواز نہ آئے وہاں کے لوگوں سے پوچھو کہ وہ کیوں اذان نہیں دیتے، اگر وہ انکار کریں تو اُن پر ٹوٹ پڑو اور اگر اقرار کریں تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جس کے وہ مستحق ہیں"۔

ائمہ مجتہدین کا اتفاق اب بحث طویل ہو جائے گی اگر ہم پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی تک کے فقہاء کی تحریریں مسلسل نقل کریں۔ لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسئلہ کے جزئیات میں مذاہبِ اربعہ کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، بہرحال نفسِ مسئلہ کہ مرتد کی سزا قتل ہے، فقہ کے چاروں مذاہب میں متفق علیہ ہے۔ امام مالک کا مذہب ان کی کتاب موطا میں یوں لکھا ہے:

"زید بن اسلم سے مالک نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنا دین بدلے اس کی گردن مار دو۔ اس حدیث کے متعلق مالک نے کہا، جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نبی

صلعم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے طریقہ کا پیرو ہوجائے مگر اپنے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کرتا ہے، جیساکہ زندیقوں اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کا ڈھنگ ہے، تو اس کا جرم ثابت ہوجانے کے بعد اُسے قتل کردیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور جو شخص اسلام سے نکل کر علانیہ کسی دوسرے طریقہ کی پیروی اختیار کرے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے، توبہ کرلے تو خیر ورنہ قتل کیا جائے۔" (باب القضاء فی من ارتد عن الاسلام)

حنابلہ کا مذہب اُن کی مستند ترین کتاب "المغنی" میں اس طرح بیان ہوا ہے :

"امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ جو عاقل و بالغ مرد یا عورت اسلام کے بعد کفر اختیار کرے اُسے تین دن تک توبہ کی مہلت دی جائے اگر توبہ نہ کرے تو قتل کردیا جائے یہی رائے حسن بصری، زہری، ابراہیم نخعی، مکحول، حماد، مالک، لیث، اوزاعی، شافعی اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔ (جلد ۱۰ صفحہ ۷۴)

مذہب حنفی کی تصریح امام طحاوی نے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں اس طرح کی ہے:

"اسلام سے مرتد ہونے والے شخص کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر امام اس سے توبہ کا مطالبہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے پھر اگر وہ شخص توبہ کرلے تو چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کردیا جائے۔ امام ابوحنیفہ، ابویوسف اور محمد رحمۃ اللہ علیہم ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے یہ رائے اختیار کی ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ توبہ کا مطالبہ کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ ان کے نزدیک مرتد کی حیثیت حربی کافر کی سی ہے۔ جن حربی کافروں تک ہماری دعوت پہنچ چکی ہے ان کو جنگ شروع کرنے سے پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا غیر ضروری ہے، البتہ جنھیں

دعوت نہ پہنچی ہو ان پر حملہ آور ہونے سے پہلے حجت تمام کرنی چاہیے۔ اسی طرح جو شخص اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر مرتد ہوا ہو اس کو تو پہلے سمجھا کر اسلام کی طرف واپس لانے کی کوشش کر لینی چاہیے مگر جو شخص علی وجہ البصیرۃ اسلام سے خارج ہوا ہو اُسے توبہ کی دعوت دیئے بغیر قتل کر دیا جائے۔ امام ابو یوسف کا بھی ایک قول اسی رائے کی تائید میں ہے، چنانچہ وہ کتاب الاملاء میں فرماتے ہیں کہ میں مرتد کو قتل کر دوں گا اور توبہ کا مطالبہ نہ کروں گا، ہاں اگر وہ خود ہی جلدی کر کے توبہ کر لے تو میں اُسے چھوڑ دوں گا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کروں گا (کتاب السیر بحث استتابۃ المرتد)

مذہب حنفی کی مزید تصریح ہدایہ میں اس طرح ہے:

"جب کوئی شخص اسلام سے پھر جائے (العیاذ باللہ) تو اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر اسے کوئی شبہ ہو تو اسے صاف کرنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ بہت ممکن ہے وہ کسی شبہ میں مبتلا ہو اور ہم اس کا شبہ دور کر دیں تو اس کا شر ایک بدتر صورت (یعنی قتل) کے بجائے ایک بہتر صورت (یعنی دوبارہ قبول اسلام) سے دفع ہو جائے۔ مگر مشائخ فقہا کے قول کے مطابق اس کے سامنے اسلام پیش کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ اسلام کی دعوت تو اس کو پہنچ چکی"۔ (باب احکام المرتدین)

افسوس ہے کہ فقہ شافعی کی کوئی معتبر کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے، مگر ہدایہ میں ان کا جو مذہب نقل کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

"شافعی سے منقول ہے کہ امام کو لازم ہے کہ مرتد کو تین دن کی مہلت دے اور اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس سے پہلے اسے قتل کر دے، کیونکہ ایک مسلمان کا ارتداد بظاہر کسی شبہ ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک مدت ضرور ہونی چاہیے جس میں اس کے لیے

خود قاتل کا موقع ہو اور ہم اس غرض کے لیے تین دن کافی سمجھتے ہیں"۔ (باب احکام المرتدین)

غالباً ان شہادتوں کے بعد کسی شخص کے لیے اس امر میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، اور یہ سزا نفس ارتداد کی ہے نہ کسی اور جرم کی جو ارتداد کیساتھ شامل ہو گیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو یہ سب کچھ سن کر پوچھتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے، تو میں ان سے صرف یہ سوال کروں گا کہ تمہاری رائے میں کیا اسلام کا پورا قانون تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو گویا تم یہ کہتے ہو کہ قرآن میں جن افعال کو جرم قرار دے کر سزا تجویز کر دی گئی ہے ان کے ماسوا کوئی فعل اسلامی حکومت میں جرم مستلزم سزا نہ ہو گا۔ پھر ایک مرتبہ غور کر لو کیا اس قاعدے پر تم دنیا میں کوئی حکومت ایک دن بھی کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہو؟ اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ قرآن کے بیان کردہ جرائم اور سزاؤں کے علاوہ اسلامی نظام حکومت میں دوسرے جرائم بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے لیے تفصیلی قانون تعزیرات کی ضرورت ہے، تو میرا دوسرا سوال یہ ہو گا کہ جو قانون نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں رائج تھا اور جس کو مسلسل تیرہ سو برس تک تمام امت کے جج مجسٹریٹ اور علمائے قانون بالاتفاق تسلیم کرتے رہے ہیں، آیا وہ اسلامی قانون کہلانے کا زیادہ مستحق ہے یا وہ قانون جسے آج چند ایسے لوگ تجویز کریں جو غیر اسلامی علوم اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن سے مغلوب و متاثر ہیں اور جن کو اسلامی علوم کی ادھوری تعلیم بھی میسر نہیں آئی ہے؟ (باقی)

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(۶)

دین

لغوی تحقیق کلامِ عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) غلبہ واقتدار، حکمرانی وفرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اُس پر اپنی قوتِ قاہرہ (Sovereignty) استعمال کرنا، اُس کو اپنا غلام اور تابعِ امر بنانا۔ مثلاً کہتے ہیں دان الناس ای قھرھم علی الطاعۃ (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا)۔ دِنتُھم فدانوا، ای قھرتُھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مطیع ہو گئے)۔ دِنتُ القومَ ای اذللتھم واستعبدتھم (یعنی میں نے اُس قوم کو مسخر کیا اور غلام بنا لیا)۔ دانَ الرجلُ اذا عزّ (فلاں شخص عزت اور طاقت والا ہو گیا)۔ دِنتُ الرجلَ حملتہ علی ما یکرہ (میں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے لیے وہ راضی نہ تھا)۔ دُینَ فلان، اذا حُمِل علی مکروہ (فلاں شخص اس کام کے لیے بزور مجبور کیا گیا)۔ دِنتُہ ای سُسْتُہ وملکتہ (یعنی میں نے اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی)۔ دَیَّنتُہ القومَ ولیتہ سیاستھم (یعنی میں نے قوم کی سیاست و حکمرانی فلاں شخص کو دی)۔ اسی معنی میں حطیئہ اپنی ماں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لقد دُیِّنتِ امرَ بنیکِ حتّٰی ترکتِھم ادقَّ من الطحین

(تو اپنے بچوں کے معاملات کی نگراں بنائی گئی تھی۔ آخرکار تو نے انھیں آٹے سے بھی زیادہ باریک کر کے چھوڑا)

حدیث میں آتا ہے الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت، یعنی عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کے لیے نافع ہو۔ اسی معنی کے لحاظ سے دیّان اُس کو کہتے ہیں جو کسی ملک یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاہر ہو اور اس پر فرمانروائی کرے۔ چنانچہ اعشی الحرمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے "یا سید الناس ودیّان العرب"۔ اور اسی لحاظ سے مَدِین کے معنی غلام اور مدینہ کے معنی لونڈی، اور ابنِ مدینہ کے معنی لونڈی زادہ کے آتے ہیں۔ جیسے اخطل کہتا ہے "ربت وربا فی حجرھا

ابن مدینة۔ اور قرآن میں ہے فَلَوْلَآ اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ تَرْجِعُوْنَھَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ یعنی اگر تم کسی کے مملوک، تابع، ماتحت نہیں ہو تو مرنے والے کو موت سے بچا کیوں نہیں لیتے، جان کو واپس کیوں نہیں پلٹا لاتے؟

(۲) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مسخر ہو جانا، کسی کے تحت امر ہونا، کسی کے غلبہ و قہر سے دب کر اس کے مقابلہ میں ذلت قبول کر لینا۔ چنانچہ کہتے ہیں دِنتُھم فدانوا، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے)۔ دِنتُ الرجل، ای خدمتہٗ (یعنی میں نے فلاں شخص کی خدمت کی)۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا اریب من قریش کلمة تدِینُ لھم بھا العرب، ای تطیعھم وتخضع لھم (یعنی میں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُسے مان لے تو تمام عرب ان کا تابع فرمان بن جائے اور اس کے آگے جُھک جائے)۔ اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دیّن کہتے ہیں، اور اسی معنی میں دین کا لفظ حدیث خوارج میں استعمال کیا گیا ہے یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیة[1]۔

(۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملت، رسم و عادت۔ مثلاً کہتے ہیں مازال ذالک دینی ودیدنی یعنی یہ ہمیشہ سے میرا طریقہ رہا ہے۔ یقال دان اذا اعتاد خیراً او شراً، یعنی آدمی خواہ بُرے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقہ کا، دونوں صورتوں میں اس طریقہ کو جس کا وہ پابند ہے دین کہیں گے۔ حدیث میں ہے کانت قریش ومن دان بدینھم، "قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے"۔ اور حدیث میں ہے انہ علیہ السلام کان علی دین قومہ، "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے" یعنی نکاح، طلاق، میراث، اور

[1] اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوارج دین یعنی ملت سے نکل جائیں گے، کیونکہ حضرت علی سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا اکفارھم، کیا یہ لوگ کافر ہیں؟ تو آپ نے فرمایا من الکفر فروا، کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں۔ پھر پوچھا گیا افمنافقون ھم، کیا یہ منافق ہیں؟ آپ نے فرمایا منافق تو خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر محققین کہتے ہیں کہ اس حدیث میں دین سے مراد طاعت امام ہے۔ چنانچہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں: اراد بالدین الطاعة، ای انھم یخرجون من طاعة الامام المفترض الطاعة وینسلخون منھا (جلد ۲، صفحہ ۱۴۴، ۲۴۳)

دوسرے تمدنی و معاشرتی امور میں انہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے جو آپ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزائے عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تدین تدان یعنی جیسا تو کرے گا ویسا بھرے گا۔ قرآن میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ "کیا مرنے کے بعد ہم کو حساب دینا جانے والا ہے اور ہمیں بدلہ ملنے والا ہے؟" عبداللہ ابن عمر کی حدیث میں آتا ہے لاتسبوا السلطان فان کان لابد فقولوا اللھم دنھم کما یدینو نا "اپنے حکمرانوں کو برا نہ کہو اور اگر کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو کہ خدایا جیسا یہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں ویسا ہی تو ان کے ساتھ کر"۔ اسی معنی میں لفظ دیان بمعنی قاضی و حاکم عدالت آتا ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علی کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کان دیان ھذہ الامۃ بعد نبیھا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اس امت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔

قرآن میں لفظ دین کا استعمال ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں، یا بالفاظ دیگر یہ لفظ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے:

غلبہ و تسلط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے،

اطاعت، تعبد اور بندگی صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے،

قاعدہ و ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے،

محاسبہ اور فیصلہ اور جزا و سزا۔

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لیے اور کبھی دوسرے کے لیے اہل عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے، مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت زیادہ بلند بھی نہ تھے اس لیے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا اور یہ کسی باقاعدہ نظام فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا تھا۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لیے مناسب پاکر بالکل واضح و متعین مفہومات کے لیے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآن کی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزا سے ہوتی ہے:

حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ،

حاکمیت کے مقابلہ میں تسلیم و اطاعت،

وہ نظامِ فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیرِ اثر بنے،

مکافات جو اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا سرکشی و بغاوت کے صلہ میں دی جائے۔

قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اول و دوم پر کرتا ہے کبھی معنی سوم پر کبھی معنی چہارم پر، اور کہیں الدین بولکر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزا سمیت مراد لیتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے حسب ذیل آیات قرآنی ملاحظہ ہوں :

دین بمعنی اول و دوم

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (المومن - ۷)

وہ اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس پر آسمان کا قبہ چھایا، جس نے تمھاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں جس نے پاکیزہ چیزوں سے تم کو رزق بہم پہنچایا، وہی اللہ تمھارا رب ہے اور بڑی برکتوں والا ہے وہ رب العالمین ـ وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، لہٰذا تم اسی کو پکارو دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ... قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ... وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (الزمر - ۲)

کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود سرِ اطاعت جھکاؤں ... کہو میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کی بندگی کروں گا، تم کو اختیار ہے اس کے سوا جس کی چاہو بندگی اختیار کرتے پھرو ... اور جو لوگ طاغوت کی بندگی کرنے سے پرہیز کریں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کریں ان کے لیے خوشخبری ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ

ہم نے تمھاری طرف کتاب برحق نازل کر دی ہے، لہٰذا تم دین کو اللہ

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ. اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ (الزمر - ۱)	کے لیے خالص کرکے صرف اسی کی بندگی کرو، خبردار ہو دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے۔
وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا، اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ۔ (النحل - ۷)	زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور دین خالصاً اسی کے لیے ہے، پھر کیا اللہ کے سوا تم کسی اور سے تقوی کروگے؟ یعنی کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے جس کے حکم کی خلاف ورزی سے تم بچوگے اور جس کی ناراضی سے تم ڈروگے؟
اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران ــ ۹)	کیا یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کا دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی مطیع فرمان ہیں اور اسی کی طرف ان کو پلٹ کر جانا ہے۔
وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاۗءَ (البینہ -)	اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ یکسو ہوکر دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے صرف اسی کی بندگی کریں۔

ان تمام آیات میں دین کا لفظ اقتدار اعلیٰ، اور اس اقتدار کو تسلیم کرکے اس کی اطاعت وبندگی قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حاکمیت، فرماں روائی، حکمرانی اللہ کے سوا کسی کی تسلیم نہ کرے، اور اپنی اطاعت وبندگی کو اللہ کے لیے اس طرح خالص کردے کہ کسی دوسرے کی مستقل بالذات بندگی و اطاعت اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک نہ کرے[1]۔

[1] یعنی اللہ کے سوا جس کی اطاعت بھی ہو اللہ کی اطاعت کے تحت اور اس کی مقررہ حدود کے اندر ہو۔ بیٹے کا باپ کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، غلام یا نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا اور اسی نوع کی دوسری تمام اطاعتیں اگر اللہ کے حکم سے ہوں اور ان حدود کے اندر ہوں جو اللہ نے مقرر کردی ہیں تو یہ عین اطاعتِ الٰہی ہیں، اور اس سے آزاد ہوں یا بالفاظ دیگر بجائے خود مستقل اطاعتیں ہوں تو یہی عین بغاوت ہیں۔ حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے، اور اگر ایسی نہیں ہے تو اس کی اطاعت جرم۔

دین بمعنی سوم

قل یایها الناس ان کنتم فی شک من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون الله ولکن اعبد الله الذی یتوفکم وامرت ان اکون من المؤمنین وان اقم وجهک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین۔ (یونس۔۱۱)

کہو کہ اے لوگو! اگر تم کو میرے دین کے بارے میں کچھ شک ہے (یعنی اگر تم کو صاف معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے) تو لو سنو، میں اُن کی بندگی و عبادت نہیں کرتا جن کی بندگی و عبادت تم اللہ کو چھوڑ کر کر رہے ہو بلکہ میں اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تمھاری روحیں قبض کرتا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤں جو اسی اللہ کو ماننے والے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تو یکسو ہو کر اسی دین پر اپنے آپ کو قائم کر دے اور شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔

ان الحکم الا لله امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم (یوسف۔۵)

حکمرانی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیک صحیح دین ہے۔

وله من فی السموات والارض کل له قانتون ... ضرب لکم مثلا من انفسکم هل لکم من ما ملکت ایمانکم من شرکاء فیما رزقنکم فانتم فیه سواء تخافونهم کخیفتکم انفسکم ... بل اتبع الذین ظلموا اهواءهم بغیر علم ... فاقم وجهک للدین حنیفا فطرت الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله ذالک الدین القیم ولکن

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، سب اُسی کے مطیع فرمان ہیں ... وہ تمھیں سمجھانے کے لیے خود تمھارے اپنے معاملے سے ایک مثال پیش کرتا ہے۔ بتاؤ، یہ غلام جو تمھارے مملوک ہیں کیا ان میں سے کوئی اُن چیزوں میں جو ہم نے تمھیں دی ہیں تمھارا شریک ہے؟ کیا تم انھیں اس مال کی ملکیت میں اپنے برابر کا حصہ دار بناتے ہو؟ کیا تم اُن سے اپنے ہم چشموں کی طرح ڈرتے ہو؟ ... سچی بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ علم کے بغیر محض اپنے تخیلات کے پیچھے چلے جا رہے ہیں ... پس تم یکسو ہو کر اپنے آپ کو اس دین پر قائم کر دو، اللہ نے جس فطرت پر انسانوں کو پیدا کیا ہے

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم — ۴)

اُسی کو اختیار کرو۔[1] اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلا جائے یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (النور — ۱)

زانی اور زانیہ دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو اُن پر رحم نہ آنا چاہیے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (التوبہ — ۵)

اللہ کے نوشتے میں تو اُس وقت سے مہینوں کی تعداد ۱۲ ہی چلی آتی ہے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ ان بارہ مہینوں میں سے ۴ مہینے حرام ہیں۔ یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف — ۹)

اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر نکالی۔ اُس کے لیے جائز نہ تھا کہ اس بادشاہ کے دین میں اپنے بھائی کو پکڑے

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (انعام — ۱۶)

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں[2] نے اپنی اولاد کے قتل کو ایک خوش آئند فعل بنا دیا تاکہ انھیں ہلاکت میں ڈالیں اور اُن کے لیے ان کے دین کو مشتبہ بنائیں۔[3]

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ

کیا انھوں نے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں جو ان کے لیے دین

[1] یعنی اللہ نے جس ساخت پر انسان کو پیدا کیا ہے وہ تو یہی ہے کہ انسان کی تخلیق میں، اس کی رزق رسانی میں، اس کی ربوبیت میں خود اللہ کے سوا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ نہ اللہ کے سوا کوئی اس کا خدا ہے نہ مالک اور نہ مطاع حقیقی۔ پس خالص فطری طریقہ یہ ہے کہ آدمی بس اللہ کا بندہ ہو اور کسی کا بندہ نہ ہو۔

[2] شریک سے مراد ہے خداوندی و فرماں روائی میں اور قانون بنانے میں خدا کا شریک۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ - ۳)	کی قسم کے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے۔
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون)	تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

ان سب آیات میں دین سے مراد قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور وہ نظام فکر و عمل ہے جس کی پابندی میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ اقتدار جس کی سند پر کسی ضابطہ و نظام کی پابندی کی جاتی ہے خدا کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ خدا میں ہے، اگر وہ کسی بادشاہ کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ بادشاہ میں ہے، اگر وہ پنڈتوں اور پروہتوں کا اقتدار ہے تو آدمی انہی کے دین میں ہے اور وہ خاندان، برادری یا جمہور قوم کا اقتدار ہے تو آدمی اُن کے دین میں ہے، غرض جس کی سند کو آخری سند اور جس کے فیصلہ کو منتہائے کلام مان کر آدمی کسی طریقے پر چلتا ہے اسی کے دین کا وہ پیرو ہے۔

دین بمعنی چہارم اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (الذاریات - ۱)	وہ خبر جس سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے (یعنی زندگی بعد موت) یقیناً سچی ہے اور دین یقیناً ہونے والا ہے۔
اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون)	تم نے دیکھا اُس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اُکساتا۔
وَمَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ، يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (انفطار)	تمہیں کیا خبر کہ یوم الدین کیا ہے، ہاں تم کیا جانو کیا چیز ہے یوم الدین وہ دن وہ ہے کہ کسی متنفس کے اختیار میں کچھ نہ ہوگا کہ دوسرے کے کام آسکے، اُس روز سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔

ان آیات میں دین بمعنی محاسبہ و فیصلہ و جزائے اعمال استعمال ہوا ہے۔

(باقی)

(حاشیہ صفحہ سابق) ؎ دین کو مشتبہ بنانے سے مطلب یہ ہے کہ جھوٹے شریعت سازوں نے اس گناہ کو ایسا خوشنما بنا کر پیش کیا کہ جس سے عرب کے لوگ اس شبہ میں پڑ گئے کہ شاید یہ فعل بھی اُسی دین کا ایک جزو ہے جو ان کو ابتداءً حضرت ابراہیم و اسماعیل سے ملا تھا۔

فہرست مضامین

بابت ماہ ذی القعدہ و ذی الحجہ ۶۱ھ (مطابق دسمبر ۴۲ء و جنوری ۴۳ء) جلد ۲۱ عدد ۵، ۶

معذرت: شعبان کے پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ تین مہینے (جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرہ اور رجب) کی اشاعتیں منسوخ کر کے آئندہ یہ رسالہ بر وقت شائع ہوتا رہیگا لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد کاغذ کی نایابی اس حد تک پہنچ گئی کہ رمضان اور شوال کے پرچے تیار ہو کر پریس میں پڑے رہے اور بازار میں ایک رم کاغذ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ پچھلے مہینوں میں کاغذ کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا تھا وہ جماعت کے لٹریچر کی طباعت میں صرف ہو گیا۔ اب ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ اور ذخیرہ فراہم ہو جائے لیکن ابھی تک پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حالات میں یہ پرچہ کب شائع ہوگا اور پھر ذی القعدہ کی اشاعت کب تک ہو سکے گی۔ جو احباب ہمارے کام سے ہمدردی رکھتے ہیں ان سے گذارش ہے کہ کاغذ مہیا کرنے میں ہماری مدد کریں۔ جب کاغذ مل سکتا تھا تو روپیہ نہ تھا۔ اب اللہ کے فضل سے روپیہ مہیا ہو گیا تو کاغذ ناپید ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فیما بین جن و انس کا برپا کیا ہوا یہ فساد کب تک اللہ کے بندوں کو ان مشکلات و مصائب میں مبتلا رکھے گا۔

(باہتمام سید ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی پریس۔ سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر "ترجمان القرآن" لاہور سے شائع ہوا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

شوال کے دوسرے ہفتہ میں حسبِ اعلان مجلس شوریٰ کا اجتماع دہلی میں ہوا تھا۔ رفقائے جماعت کو اُس وقت سے روداد کی اشاعت کا انتظار ہے، مگر مجھے گوناگوں پریشانیوں نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ سکون کے ساتھ روداد مرتب کرتا۔ جو لوگ مجھ سے قریب تر ہیں اور حالات سے واقف ہیں انھیں رپورٹ نہ شائع ہونے پر شکایت نہیں ہے البتہ جو لوگ دور ہیں اور نہیں جانتے کہ میں اس وقت کن مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہوں اُن کے لیے یہ تاخیر یقیناً جائز وجہِ شکایت ہے اور میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان سے معافی کی درخواست کروں۔

مجلس شوریٰ کے انعقاد کی اصلی غرض چند ایسے اختلافات کا حل تلاش کرنا تھا جو بدقسمتی سے ابتدائی مرحلہ ہی میں اس نازک موقع پر نظامِ جماعت کے اندر رونما ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اقامتِ دین کی یہ منظم کوشش، جو ایک صدی کے تعطل کے بعد پھر بشکل شروع ہوئی ہے، شروع ہوتے ہی ختم نہ ہو جائے، اور ایسے مایوس کن اثرات اپنے پیچھے نہ چھوڑ جائے کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اس کی ناکامی مدتوں تک ایک مثال بن کر دینِ حق کے قیام کی سعی و جہد سے روکتی رہے۔ میں نے ان اختلافات کو سلجھانے کی جتنی کوششیں کیں اُن میں مجھے سخت ناکامی ہوئی، اور صرف ناکامی ہی نہیں ہوئی بلکہ تفرق و اختلاف اور بددلی اور بدگمانیوں کا زہر دور و نزدیک کے ارکان میں بالعموم پھیلنا شروع ہو گیا۔ تب میں نے مجبور ہو کر اصحابِ شوریٰ کو دہلی میں جمع ہونے کی تکلیف دی تاکہ اس الجھن کو دور کرنے میں میری مدد کریں۔

چار پانچ روز ہم لوگ اس کام میں منہمک رہے۔ اولاً میں نے چاہا کہ اصل امورِ مختلف فیہ کو زیرِ بحث لایا جائے اور جو

لوگ مجھ سے یا میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں وہ خفیہ پرچہ نویسی اور نجویٰ اور غیبت اور ارجاف کو چھوڑ کر جماعت کے سامنے اپنی بے اطمینانی کے اسباب صاف صاف بیان کر دیں، پھر اگر جماعت اُن کے بیان سے مطمئن ہو جائے تو مجھے رہنمائی کے منصب سے معزول کر دیا جائے۔ لیکن ان حضرات نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا۔ اس کے بعد میں نے جماعت کے سامنے تین متبادل صورتیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ میں خود استعفیٰ دیتا ہوں، میری جگہ کسی دوسرے شخص کو رہنما منتخب کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص نہیں ملتا تو تین چار آدمی مل کر اس کام کو سنبھال لیں۔ تیسرے یہ کہ سرے سے یہ نظام جو ہم نے بنایا ہے اسے توڑ دیا جائے اور اُن سب لوگوں کو جو اس نصب العین کی خدمت کا عہد کر چکے ہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس شخص کا جس پر اطمینان ہو اس سے وابستہ ہو کر کام کرے، اور جو لوگ کسی دوسرے سے مطمئن نہ ہوں مگر خود اپنے اوپر اطمینان رکھتے ہوں وہ خود اٹھیں اور کام کریں، اور جو لوگ دوسروں سے بھی مایوس ہوں اور اپنے آپ سے بھی وہ کسی اور امام مہدی کے ظہور کا انتظار کریں۔ پہلی تجویز اس بنا پر بالاتفاق رد کر دی گئی کہ جو لوگ اس وقت تک جماعت میں شامل ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس بار کو سنبھال نہیں سکتا۔ خود اختلاف کرنے والے اصحاب بھی اس امر پر متفق تھے۔ دوسری تجویز بھی بالاتفاق رد کر دی گئی کیونکہ نہ وہ شرعاً صحیح ہے اور نہ عملاً ہمارے مقصد کے لیے مفید۔ رہی تیسری تجویز تو اختلاف رکھنے والے اصحاب کی خواہش یہ تھی کہ اسی پر عمل کیا جائے اور میں خود بھی اسی طرف مائل تھا کیونکہ میں ایسے مختلف المزاج عناصر کے اجتماع میں کوئی خیر نہ دیکھتا تھا جو ترکیب و امتزاج قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور اُن کم سے کم ضروری صفات سے بھی عاری ہوں جن کے بغیر کوئی کارکن جماعت نہیں بن سکتی لیکن اصحاب شوریٰ کی اکثریت نے اس تجویز سے سخت اختلاف کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس طرح جماعت کو توڑ کر ہم اپنے نصب العین کی خدمت کرنے کے بجائے اس کے ساتھ دشمنی کریں گے اور ہماری یہ حرکت اس جمود کے بقا و استمرار کے لیے ایک اور حجت بن جائے گی جو بالاکوٹ کی ٹریجڈی کے بعد سے ایک سو دس برس تک مسلسل اس تحریک پر طاری رہا ہے، اس لیے بجائے اس کے کہ چند اشخاص کے اختلاف کی وجہ سے جماعت ٹوٹے کیوں نہ وہ اشخاص جماعت سے ٹوٹ جائیں جو ساتھ مل کر نہیں چل سکتے۔ یہ دلیل اتنی وزنی تھی کہ آخر کار اسی کو غلبہ حاصل ہوا۔ جو حضرات اختلاف سے متاثر تھے ان میں سے بعض نے رجوع کر لیا اور صرف چار اصحاب ایسے رہ گئے جنہوں نے اختلاف پر قائم رہتے ہوئے جماعت سے

علیحدگی اختیار کرلی۔ ان اصحاب کے نام ظاہر کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے مگر وہ خود اپنی علیحدگی کا اعلان پسند نہیں کرتے اس لیے بہتر ہے کہ ابھی اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جائے۔ اگرچہ

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

لیکن ان حضرات کی علیحدگی کے بعد بھی میں جماعت کی قیادت کا بار سنبھالنا اس وقت تک جائز نہ سمجھتا تھا جب تک کہ رفقاء جماعت کو اختلاف کی پوری حقیقت سے آگاہ کرکے یہ دریافت نہ کرلیتا کہ آیا اس کے بعد بھی وہ مجھ پر اعتماد رکھتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے علیحدہ ہونے والوں کی وہ تحریر جس میں انھوں نے میری ذات پر اور میرے کام پر اپنے اعتراضات تفصیل کے ساتھ بیان کیے تھے جماعت کے سامنے پیش کردی اور ہر اعتراض کا جو جواب میرے پاس تھا وہ بھی بیان کردیا۔ پھر رفقاء سے عرض کیا کہ دونوں پہلوؤں کا بے لاگ موازنہ کرلیں اور آزادی کے ساتھ فیصلہ کریں کہ جس شخص کو انھوں نے ایک سال پہلے اپنا رہنما منتخب کیا تھا وہ اب بھی ان کی نگاہ میں اس لائق ہے یا نہیں کہ وہ اسے رہنما تسلیم کریں۔ جماعت کی طرف سے اس سوال کا جواب اثبات میں تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ تحریر جس کا تعلق تنہا میری ذات سے نہیں بلکہ دراصل جماعت اور تحریک سے ہے مجھ کو بصیغۂ راز دی گئی ہے اور ابھی تک اس کے مصنف اسے پرائیویٹ رکھنے ہی پر مصر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اسے اور اپنے جواب کو بلا تامل شائع کردیتا۔ الحمدللہ کہ میری زندگی میں کوئی راز نہیں ہے اور نہ میں پبلک زندگی اور پرائیویٹ زندگی کے فرق کا قائل ہوں خصوصاً جبکہ میں بندگانِ خدا کو ایک راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں تو لوگوں پر میرا عیب و صواب سب کچھ کھل جانا چاہیے۔ میں نہ خود فریبِ نفس میں مبتلا ہوں، نہ خدا کو فریب دینا چاہتا ہوں، نہ خلقِ خدا کو۔ میں نے اس دین کے راستہ کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ کر نہیں بلکہ خود اپنی ہی آنکھوں سے دیکھ کر اختیار کیا ہے اور معیارِ دینی کے لحاظ سے اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ جو کچھ میں فی الواقع ہوں اس کے سوا کچھ اور اپنے آپ کو ظاہر کرنا میرے نزدیک حرام ہے۔ اگر کوئی مجھ کو میرے اصلی مقام سے بلند تر قرار دے تو مجھے اس کی غلط فہمی رفع کرنے میں بھی کوئی باک نہیں۔ اور اسی طرح اگر کوئی مجھ کو اس سے فروتر ٹھہرائے تو اس کی یہ رائے بھی مجھے متاثر نہیں کرسکتی۔ جتنی اور جیسی خدمتِ دین بجا لانے کی اہلیت اور طاقت میں خود

اپنے اندر پاتا ہوں اسے بہرحال انجام دوں گا خواہ کسی کے نزدیک میں اس کا اہل ہوں یا نہ ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ ابھی جماعت میں کچھ اور لوگ ایسے موجود ہیں جو مجھ سے یا میرے طریقِ کار سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ جگہ جگہ رفقائے جماعت میں بددلی پھیلاتے پھر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے عرض کروں گا کہ یہ ایک پاک جماعت ہے، جو ایک پاکیزہ ترین مقصد کے لیے بنائی گئی ہے۔ براہ کرم وہ اسے سیاسی جماعتوں کے سے ناپاک طریقوں سے گندہ نہ کریں۔ اُن کے لیے جائز اور معقول طریقہ یہ ہے کہ یا تو جماعت کے سامنے آکر دلیل و حجت سے میری نااہلی ثابت کریں اور مجھے رہنمائی کے منصب سے ہٹا دیں، یا پھر صبر کے ساتھ میری اطاعت کریں، یا اگر صبر بھی نہیں ہو سکتا تو جماعت سے نکل جائیں اور جو کچھ ان کو حق اور صواب نظر آتا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ غیبت اور نجویٰ اور ارجاف جس میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں، جماعتی اخلاق کے اعتبار سے بدترین جرائم ہیں جن کی سخت مذمت قرآن میں کی گئی ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو مجھے مجبوراً ان کے خلاف سخت کارروائی کرنی پڑے گی۔ اب تک میں نے بہت سی فتنہ پردازیوں کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا ہے لیکن اب میں کسی کے ساتھ رعایت کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں۔ جماعتی نظام کے تحفظ کی ذمہ داری خدا اور خلق دونوں کے سامنے مجھ پر عائد ہوتی ہے، اور میں مجرم ہوں گا اگر جماعت کے اندر فتنہ پھیلانے کی اجازت دوں۔ جماعت بنانے کی غرض یہ تھی کہ ہم اپنی اصلاح اور دنیا کی اصلاح کے لیے ایک دوسرے کے معاون بنیں اور قوتوں کو مجتمع کر کے اس سے زیادہ کام کریں جو انفرادی طور پر الگ الگ کر سکتے تھے، نہ یہ کہ ایک دوسرے کے لیے عیب چیں، خوردہ گیر اور خارِ راہ بن جائیں اور جو کچھ ہم میں سے ایک شخص تنہا کر سکتا تھا اتنا بھی اسے نہ کرنے دیں۔

رفقائے جماعت کو میں ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے میں سے جس شخص کو وہ انفرادی طور پر نجویٰ کرتے اور بددلی پھیلاتے دیکھیں اس کی باتیں سننے سے انکار کر دیں اور اسے مجبور کریں کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، افراد سے الگ الگ نہ کہے بلکہ مقامی جماعت کے اجتماع میں شریک ہو کر باقاعدہ اپنے اعتراضات بیان کرے۔ پھر اس کے اعتراضات اس کے سامنے ضبطِ تحریر میں لائے جائیں اور میرے پاس

بھیج دیے جائیں، میں جماعت کو اس کے اعتراضات کی حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔ رفیقوں کو خوب جان لینا چاہیے کہ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ یہ دراصل شیطان ہے جو اس کام کو برباد کرنے کے لیے ایک ایک شخص کے پاس جا کر اُسے اکسانے کی کوشش کر رہا ہے، جماعت کا سامنا کرنے سے وہ بچتا ہے اور افراد کو الگ الگ شکار کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی چالوں کا مقابلہ کرنے کی یہی صورت ہے کہ انفرادی سرگوشیوں کے لیے کان بند کر لیے جائیں اور ہر اس شخص کو جو کسی چیز پر ناراض یا معترض ہو مجبور کر دیا جائے کہ یا تو وہ جماعت کے سامنے آکر اپنے اسبابِ ناراضی اور وجوہِ اعتراض بیان کرے ورنہ جماعت سے الگ ہو جائے۔

جس قدر اعتراضات اب تک میرے علم میں آئے ہیں ان کی تہ میں چند خرابیاں کام کر رہی ہیں جن پر یہاں متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ بالعموم افرادِ جماعت کو انہی خرابیوں میں سے کسی نہ کسی کے ثمرات سے سابقہ پیش آئے گا۔

سب سے پہلی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اکثر لوگ اقامتِ دین کی تحریک کے لیے کسی ایسے مردِ کامل کو ڈھونڈتے ہیں جو ان میں سے ایک ایک شخص کے تصورِ کمال کا مجسمہ ہو اور جس کے سارے پہلو قوی ہی قوی ہوں، کوئی پہلو کمزور نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ دراصل نبی کے طالب ہیں، اگرچہ زبان سے ختمِ نبوت کا اقرار کرتے ہیں اور کوئی اجرائے نبوت کا نام بھی لے دے تو اس کی زبان گدی سے کھینچنے کے لیے تیار ہو جائیں مگر اندر سے ان کے دل ایک نبی مانگتے ہیں اور نبی سے کم کسی پر راضی نہیں ہیں کہ اس کی قیادت میں دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کریں۔ یہی ذہنیت ہے جس کی بدولت ایک گروہ "مرشدِ ازغیب" کے انتظار میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا اور ایک دوسرے گروہ نے آخر کار اجرائے نبوت کا ارتکاب کر ڈالا۔ بخلاف اس کے میں جس نظریہ پر کام کر رہا ہوں وہ اس ذہنیت کے بالکل برعکس ہے۔ مجھے اس امر کا کوئی ثبوت کتاب و سنت میں نہیں ملا کہ خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے مردِ کامل کا وجود شرط ہے اور وہ نہ ملے تو یہ فریضہ امت پر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں یہ کام بہر حال کرنے کا ہے، اگر مردِ کامل نہیں ملتا تو ہم مردانِ ناقص ہی کو مل کر اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر میں نے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے واقف ہونے کے باوجود دعوتِ دینی شروع کی تھی، اور جب یہ دعوت اس حد تک پہنچی کہ لوگوں کو جمع کر کے ایک منظم جتھہ بنانا ممکن ہو گیا تو میں نے رفقائے سفر سے اول روز ہی کہہ دیا تھا کہ نہ میں مردِ کامل ہوں، نہ آپ لوگوں میں سے کوئی کامل ہے، ہم میں سے ہر ایک کسی پہلو میں ناقص اور کسی دوسرے پہلو میں کامل یا قریب بکمال ہے، لہٰذا آیئے ہم مل کر ایک مردِ کامل بننے کی کوشش کریں۔

اگر ہم حتی الامکان ایک دوسرے کے نقائص کو دور کرنے میں معاون بن گئے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے قوی پہلو سے دوسرے کے کمزور پہلو کی تلافی کرے گا تو بحیثیتِ مجموعی ہماری یہ جماعت اس کمال کی حامل ہو جائے گی جس کے ساتھ ہم اللہ کا کلمہ بلند کر سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ یہ نظریہ بہت کم لوگوں کے دلوں میں اتر سکا ہے اور بار بار کی فہمائش کے باوجود حال یہ ہے کہ بہت سے رفیق رہنمائی کے منصب پر ایک نبی مبعوث من اللہ کو ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں، خوردبین لگا لگا کر مجھے دیکھتے ہیں، پھر ہر ایک اپنے اپنے تصور کمال کے لحاظ سے ایک فہرست بنا کر میرے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ یہ یہ خامیاں اپنے اندر سے نکالو اور یہ یہ صفات کمالیہ اپنے اندر پیدا کرو تب کام چلے گا، اور جب ہفتہ دو ہفتہ میں میرے اندر ان کے منشا کے مطابق انقلاب نمایاں نہیں ہو جاتا تو بس ان کے دل بیٹھنے لگتے ہیں اور خود ہی بیٹھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے دل بٹھانے کی بھی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

مجھے ان لوگوں کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کے سوچنے کا انداز کیسے بدل دوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے ان سے وہ مدد نہیں ملتی جس کا میں خود اپنی تکمیل کے لیے محتاج ہوں، نہ میں ان کے کمزور پہلوؤں کی تقویت کے لیے کچھ کر سکتا ہوں جن میں اللہ نے مجھ کو ان سے زیادہ قوت بخشی ہے، اور نہ اجتماعی قوی سے وہ طاقت و شخصیت ہی بننے پاتی ہے جو کوئی بڑا کام انجام دینے کے قابل ہو۔

اسی سلسلہ کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ وہ مختلف عناصر جن سے اس جماعت کی ترکیب ہوئی ہے، ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے بمشکل آمادہ ہوتے ہیں۔ نہ ان میں اتنا صبر ہے کہ ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھیں اور بتدریج ایک دوسرے کی اصلاح و تربیت کریں۔ نہ اتنا انصاف ہے کہ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی کمزوریوں کا اور دوسروں کی کمزوریوں کے ساتھ ان کی خوبیوں کا بھی احساس و اعتراف کریں۔ نہ اتنی لچک ہے کہ کسر و انکسار سے ایک متحد المزاج معجون بننے کے لیے تیار ہوں، نہ اتنا حسن ظن ہے کہ جو لوگ انہی کی طرح ایک دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے آئے ہیں ان کے عمل میں اگر کچھ کوتاہی پائیں تو اس کو ارادی فجور و عصیان یا قصدی غلط کاری کے سوا کسی اور سبب پر بھی محمول کر سکیں۔ ہر ایک جس طبقہ سے آیا ہے اور جس رنگ میں رنگا ہوا ہے اب تک مانوس رہا ہے اسی میں پوری جماعت کو رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، اور اس سے مختلف رنگ دیکھ کر دل برداشتہ ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ ذہنیت اس جماعت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے اور اس کا نتیجہ پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک طبقے اور ایک ایک رنگ کے لوگ الگ الگ گروہ بن جائیں اور ہر ایک گروہ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی ان کمزوریوں اور خامیوں کا بھی حامل رہے جن کی بدولت اب تک ہمارا کوئی گروہ اقامتِ دین کے لیے کوئی قابلِ ذکر سعی نہیں کر سکا ہے۔ ہماری اس جماعت کی خوبی یہ تھی کہ اس نے ایک کلمے اور ایک نصب العین کی کشش سے تمام مختلف

طبقات کے لوگوں کو کھینچ کر یکجا کر دیا۔ ان میں وہ نئے طبقہ کے لوگ بھی ہیں جو جاہلیت جدیدہ میں غرق ہو چکے تھے اور اب اللہ نے ان کی آنکھیں کھول کر راہ راست انھیں دکھا دی۔ ان میں وہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی ہیں جو نئے اور پرانے رنگ کی مخلوط سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ پرانے رنگ کے لوگ بھی ہیں جن میں کچھ شرعی صورت کی تقلید اور کچھ دور انحطاط کے قدامت پرستانہ تعصبات ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک طبقہ اپنے اندر کچھ خوبیاں رکھتا ہے جو دوسرے طبقہ میں نہیں ہیں اور کچھ خرابیاں رکھتا ہے جن سے دوسرا طبقہ محفوظ ہے۔ ہماری اس جماعت کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ یہ سب مل کر باہمی رفاقت، صحبت اور تعاون سے بتدریج ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کرنے اور ایک دوسرے کی خوبیاں جذب کرنے کی کوشش کریں، اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ ان میں تحمل ہو، صبر ہو، ہمدردی ہو، انصاف ہو، لچک ہو، حسن ظن ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک یہ اسپرٹ بہت کم پیدا ہوئی ہے۔ خصوصاً پرانے طرز کا طبقہ اس معاملہ میں دوسرے طبقوں کی نسبت زیادہ شدت پسند ثابت ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اپنی خوبیوں کا مبالغہ آمیز تصور رکھتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں، دوسروں کی خوبیوں کا اندازہ ہمیشہ کم لگاتے ہیں اور انھیں جذب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اور جس دینداری کو انھوں نے وراثتاً آسانی کے ساتھ پایا ہے اس کا رنگ اُن لوگوں پر فوراً چڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ ایک دوسرے رنگ میں گزر چکا ہے اور جنھیں نیا رنگ اختیار کرنے میں سخت مشکلات سے دوچار ہونا ہے۔ جہاں تک حقیقی دینداری کا تعلق ہے اس کی بہت سی خصوصیات سے یہ لوگ ابھی خود محروم ہیں کیونکہ وراثتہً انھیں وہ چیزیں نہیں ملیں، اور انھیں اختیار کرنا ان کے لیے بھی ویسا ہی مشکل ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دوسروں کی پوزیشن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بہت جلدی دل برداشتہ ہو کر بھاگ نکلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ابھی اس سلسلہ کی چند اور خرابیاں میری نگاہ میں ہیں جنھیں آئندہ اشاعت میں بیان کروں گا۔ یہاں مجلس شوریٰ کے دو مزید فیصلوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ پنجاب، یوپی، بہار اور دکن میں جماعت کی تنظیم کے لیے جو بڑے بڑے حلقے بنا کر نائبین امیر کو تفویض کیے گئے تھے، انھیں باستثناء حلقہ دکن توڑ دیا گیا اور اب ان تمام علاقوں کی جماعتوں کا تعلق براہ راست مرکز سے ہوگا۔ دوسرے یہ کہ مرکز میں تعمیری کام کا جو نقشہ میں نے بنایا تھا، اور جو ربیع الآخر کے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے اس پر مجلس نے تفصیلی غور کیا اور اس سے اتفاق کر لیا۔

تفہیم القرآن

(۷)

آل عمران

(از رکوع ۱۰ تا ختم سورہ)

تم نیکی کا مقام نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو۔[۷۱] اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔
[۷۲] کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدی میں حلال کی گئی ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں،

---

۷۱ اوپر سے جو سلسلۂ تقریر چلا آ رہا ہے اس میں خطاب کا رُخ یہودیوں کی طرف ہے۔ اس آیت میں ان کی اُس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے جو وہ "نیکی" کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصور جس یہ تھا کہ صدیوں کے توارث سے "تشرع" کی جو ایک خاص شکل ان کے ہاں بن گئی ہے اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اُتار لے اور ان کے علماء کی قانونی موشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا ہے اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی و فروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے۔ اس تشرع کی ظاہری سطح کے نیچے بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے "دیندار" لوگ تنگ دلی، حرص، بخل، حق پوشی اور حق فروشی کے عیوب چھپائے ہوئے تھے اور رائے عام ان کو نیک سمجھتی تھی۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے انھیں بتایا جا رہا ہے کہ "نیک انسان" ہونے کا مقام اُن چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدارِ خیر و صلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل روح خدا کی محبت ہے، ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو، جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آ جائے کہ وہ اسے خدا کی محبت پر قربان نہ کر سکتا ہو بس وہی بُت ہے اور جب تک اس بُت کو آدمی توڑ نہ دے، نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اس روح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تشرع کی حیثیت محض اُس چمکدار روغن کی سی ہے جو گھن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو۔ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا نہیں کھا سکتا۔

۷۲ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علمائے یہود کوئی اصولی اعتراض نہ کر سکے (باقی صفحہ ۴۱۰ پر)

البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں توراۃ کے نازل کیے جانے سے پہلے بنی اسرائیل[۵۱] نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ توراۃ اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔ کہو، اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے، تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے، اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔[۵۲]

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔[۵۳] اس کو خیر و برکت دی گئی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنا دیا گیا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں،[۵۴] ابراہیم کا مقام عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔[۵۵] لوگوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کیونکہ اساسِ دین جن امور پر ہے اُن میں انبیاء سابقین کی تعلیمات اور نبی عربی کی تعلیم میں یک سر مو فرق نہ تھا تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلہ میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں۔ اسی اعتراض کا یہاں جواب دیا جا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱۔ "اسرائیل" سے مراد اگر بنی اسرائیل لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ نزولِ توراۃ سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے رکھی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوب لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں اُسے ممنوع سمجھ لیا۔ یہی مؤخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔

۵۲۔ مطلب یہ ہے کہ ان فقہی جزئیات میں کہاں جا پھنسے ہو۔ دین کی جڑ تو اللہ واحد کی بندگی ہے جسے تم نے چھوڑ دیا اور شرک کی آلائشوں میں مبتلا ہو گئے۔ اب بحث کرتے ہو فقہی مسائل میں، حالانکہ یہ وہ مسائل ہیں جو اصل ملتِ ابراہیمی سے ہٹ جانے کے بعد انحطاط کی طویل صدیوں میں تمہارے علماء کی موشگافیوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۵۳۔ یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا، حالانکہ پچھلے انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بقرہ میں دیا جا چکا ہے لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مُصر رہے۔ لہٰذا یہاں پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ (حاشیہ ۵۴ و ۵۵ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

کہو، اے اہلِ کتاب تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو، اے اہلِ کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اُسے بھی تم اللہ کے راستہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔ ع ۱۰

(بقیہ سابقہ) ۸۰ یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرما لیا ہے۔ لق و دق بیابان میں بنایا گیا اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام کر دیا۔ دو ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کے سبب سے تمام عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا، مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطرافِ کعبہ ہی کا ایک خطہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا، بلکہ اسی کعبہ کی یہ برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینہ کے لیے پورے ملک عرب کو اس کی بدولت امن میسر آجاتا تھا۔ پھر ابھی نصف صدی پہلے ہی سب دیکھ چکے تھے کہ ابرھہ، جس نے کعبہ کی تخریب کے لیے مکہ پر حملہ کیا تھا، اس کی فوج کس طرح قہرِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ اس واقعہ سے اُس وقت عرب کا بچہ بچہ واقف تھا اور اس کے چشم دید شاہد تک ان آیات کے نزول کے وقت موجود تھے۔

۸۱ جاہلیت کے تاریک دور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے اور ایک کو دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔[1] سب مل کر اللہ کی رسّی[2] کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔[3] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔[4]

---

[1] یعنی مرتے دم تک اللہ کی فرماں برداری اور وفاداری پر قائم رہو۔

[2] اللہ کی رسی سے مراد اُس کا دین ہے، اور اس کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسّی کو مضبوط پکڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت "دین" کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں، اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور اُن کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں، پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

[3] یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کے کشت و خون جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انھیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئی ہیں اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے تھے اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اَوس اور خَزرج کے وہ قبیلے جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے اور یہ دونوں قبیلے مکہ سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے۔ (حاشیہ ۴ اگلے صفحہ پر ہے)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔[۱۱] جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے جبکہ کچھ لوگ سُرخ رو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہوگا۔ جن کا منہ کالا ہوگا ان سے کہا جائے گا کہ نعمتِ ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفرانِ نعمت کے صلہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو اُن کو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ وہ اسی حالت میں رہیں گے۔ یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔[۱۲] زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ع ۱۱

(بقیہ سابق) [۱۰] یعنی اگر تم آنکھیں رکھتے ہو تو ان علامتوں کو دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہو کہ آیا تمھاری فلاح اِس دین کو مضبوط تھامنے میں ہے یا اِسے چھوڑ کر پھر اُسی حالت کی طرف پلٹ جانے میں جس کے اندر تم پہلے مبتلا تھے، آیا تمھارا اصلی خیر خواہ اللہ اور اس کا رسول ہے یا وہ یہودی اور مشرک اور منافق لوگ جو تم کو حالتِ سابقہ کی طرف پلٹا لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۱] یہ اشارہ ان امتوں کی طرف ہے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں سے دینِ حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدت گزر جانے کے بعد اس دین کو چھوڑ کر غیر متعلق ضمنی و فروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کر دیے اور فضول و لایعنی باتوں پر جھگڑنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انھیں اُس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے ان کے سپرد کیا تھا اور نہ عقیدہ و اخلاق کے ان بنیادی اصولوں سے دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح و سعادت کا مدار ہے۔

[۱۲] یعنی چونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا اس لیے وہ ان کو سیدھا راستہ بھی بتا رہا ہے اور اس بات سے بھی قبل از وقت آگاہ کیے دیتا ہے کہ آخر کار وہ کن امور پر اُن سے باز پرس کرنے والا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ کج روی اختیار کریں اور اپنے غلط طرزِ عمل سے باز نہ آئیں وہ اپنے اوپر آپ ظلم کریں گے۔

اب[1] دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب[2] ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔

یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے[3]۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم

---

[1] یہ وہی مضمون ہے جو سورہ بقرہ کے سترھویں رکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمھارے سپرد کیا گیا ہے اور تمھیں لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور ان غلطیوں سے بچو جو تمھارے پیش رو کر چکے ہیں۔

[2] اشارہ ہے یہودیوں کی طرف۔

[3] یعنی دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب بھی ہوا ہے تو وہ اُن کے اپنے بل بوتے پر قائم کیا ہوا امن و چین نہیں ہے بلکہ دوسروں کے ماتحت ذمی رعایا ہونے کی حیثیت سے ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے اپنے طور پر انھیں اپنی حمایت میں لے لیا۔

ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلہ میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد، وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اُس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ اُن لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے[۱]۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ

---

[۱] اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے، ہوا سے مراد وہ اوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہِ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ میں دولت صرف کرتے ہیں، اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطۂ خداوندی کی پیروی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہوا کھیتیوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے، اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کے مزرعۂ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے مگر جب اُس کے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مہلک بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے اور اس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرف کر رہا ہے، اور یہ مملکت بھی اللہ ہی کی ہے جس کے اندر رہ کر انسان کام کر رہا ہے۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے، اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرف کرتے ہوئے اصل مالک کے قانون و ضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا، تو اس کے یہ تمام تصرفات از سر تا پا جرم بن جاتے ہیں۔ اجر ملنا کیسا، وہ تو اس کا مستحق ہے کہ ان تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے۔

تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے[ا] ۔ تمھیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض اُن کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دیدی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے)۔ تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتبِ آسمانی کو مانتے ہو[ب]۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمھارے رسول اور تمھاری کتاب کو) مان لیا ہے، مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمھارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا

[ا] مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اوس اور خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی اِن قبیلوں کے افراد اُن کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہوگئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پُرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہوگیا ہو۔ انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے، مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ و فساد برپا کردیں اور ان کے جماعتی راز معلوم کرکے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں اُن کی اسی منافقانہ روش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرمارہا ہے۔

[ب] یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اس کے کہ تمھیں اُن سے ہوتی، اُن کو تم سے ہے۔ تم تو قرآن کے ساتھ توراۃ کو بھی مانتے ہو اس لیے اُن کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی، البتہ شکایت اگر ہوسکتی تھی تو تمھیں اُن سے ہوسکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے۔

یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ــــ ان سے کہدو کہ اپنے غصہ میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ــــ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے۔ ع۱۲

(اے؎ پیغمبر! مسلمانوں کے سامنے اُس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے

؎ یہاں سے چوتھا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جنگِ احد کے بعد نازل ہوا اور اس میں جنگِ احد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اوپر کے خطبہ سے اس خطبہ کا تعلق سمجھنے کے لیے اُس کے آخری فقرے پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اُس میں ارشاد ہوا ہے "اُنکی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو"۔ اب چونکہ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کا سبب ہی یہ ہوا کہ ان کے اندر صبر کی بھی کمی تھی اور ان کے افراد سے بعض ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں جو خدا ترسی کے خلاف تھیں، اس لیے یہ خطبہ جس میں انھیں ان کمزوریوں پر متنبہ کیا گیا ہے مندرجۂ بالا فقرے کے بعد ہی متصلاً درج کیا گیا۔

اس خطبہ کا اندازِ بیان یہ ہے کہ جنگِ اُحد کے سلسلہ میں جتنے اہم واقعات پیش آئے تھے اُن میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر چند چچے تلے فقروں میں نہایت سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کے واقعاتی پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

شوال ۳ھ کی ابتدا میں کفارِ قریش تقریباً ۳ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ تعداد کی کثرت کے علاوہ ان کے پاس سازوسامان بھی مسلمانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا، اور پھر وہ جنگِ بدر کے انتقام کا شدید جوش بھی رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تجربہ کار صحابہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مدافعت کی جائے۔ مگر چند نوجوانوں نے جو شہادت کے شوق سے بے تاب تھے اور جنھیں بدر کی جنگ میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا، باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آخر کار ان کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور ہو کر باہر نکلنے ہی کا فیصلہ کر لیا۔ ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ نکلے۔ مگر مقامِ شوط پر پہنچ کر عبداللہ ابن اُبَی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عین وقت پر اس کی اس حرکت سے مسلمانوں کے لشکر میں اچھا خاصا اضطراب پھیل گیا، حتیٰ کہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے لوگ تو ایسے دل شکستہ ہوئے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

انھوں نے بھی پلٹ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر اولوالعزم صحابہ کی کوششوں سے یہ اضطراب رفع ہو گیا۔ ان باقی ماندہ سات سو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور اُحد کی پہاڑی کے دامن میں (مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر) اپنی فوج کو اس طرح صف آرا کیا کہ پہاڑ پشت پر تھا اور قریش کا لشکر سامنے۔ پشت کی طرف صرف ایک درہ ایسا تھا جس سے عقبی حملہ کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہاں آپ نے عبداللہ بن جبیر کے زیر قیادت پچاس تیر انداز بٹھا دیے اور ان کو تاکید کر دی کہ کسی کو ہمارے قریب نہ پھٹکنے دینا، کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا، اگر تم دیکھو کہ ہماری بوٹیاں پرندے نوچے لیے جاتے ہیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ٹلنا۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ابتداءً مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ لیکن اس ابتدائی کامیابی کو کامل فتح کی حد تک پہنچانے کے بجائے مسلمان مالِ غنیمت کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے لشکر کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اُدھر جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا انھوں نے جو دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے اور غنیمت لُٹ رہی ہے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت کی طرف لپکے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دلا کر بہتیرا روکا مگر چند آدمیوں کے سوا کوئی نہ ٹھیرا۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے جو اس وقت لشکر کفار کے رسالہ کی کمان کر رہے تھے بروقت فائدہ اُٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب کے درہ سے حملہ کر دیا۔ عبداللہ بن جبیر نے جن کے ساتھ صرف چند ہی آدمی رہ گئے تھے، اس حملہ کو روکنا چاہا مگر مدافعت نہ کر سکے اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصہ پراگندہ ہو کر بھاگ نکلا تاہم چند بہادر سپاہی ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہ کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپ خود زخمی ہو چکے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی لیکن عین وقت پر صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلعم زندہ ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس موقع پر یہ ایک معمّا ہے جو حل نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے کفار مکہ کو خود بخود واپس پھیر دیا۔ مسلمان اس قدر پراگندہ ہو چکے تھے کہ ان کا پھر مجتمع ہو کر باقاعدہ جنگ کرنا مشکل تھا۔ اگر کفار اپنی فتح کو کمال تک پہنچانے پر اصرار کرتے تو ان کی کامیابی بعید نہ تھی۔ مگر نہ معلوم کس طرح وہ آپ ہی آپ میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

نکلے تھے اور (اُحد کے میدان میں) مسلمانوں کو جنگ کے لیے جا بجا مامور کر رہے تھے۔ اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔ (وہ اُس وقت بے خبر نہ تھا) جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے[۱۵] حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگِ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

(انھیں اس وقت کی بات یاد دلاؤ) جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے "کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟[۱۶]" ___ بے شک، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمھیں اس لیے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے (اور یہ مدد وہ تمھیں اس لیے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔

(اے پیغمبر!) فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انھیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ معاف کرنے والا اور

---

[۱۵] یہ اشارہ ہے بنو سلمہ اور بنو حارثہ کی طرف جن کی ہمتیں عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کے بعد پست ہو گئی تھیں۔

[۱۶] مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک طرف دشمن تین ہزار ہیں اور ہمارے ایک ہزار میں سے بھی تین سو الگ ہو گئے ہیں تو ان کے دل ٹوٹنے لگے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ الفاظ کہے تھے۔

سو ۳

رحیم ہے۔[۵۱]

اے ایمان لانے والو! سود در سود کھانا چھوڑ دو[۵۲] اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ۔۔۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں[۵۳] ۔۔۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ۔۔۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے

۵۱؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہوئے تو آپ کے منہ سے کفار کے حق میں بددعا نکل گئی اور آپ نے فرمایا کہ "وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کو زخمی کرے"۔ یہ آیات اسی کے جواب میں ارشاد ہوئی ہیں۔

۵۲؎ اُحد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لوٹنے لگے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے طمع زر کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا۔ سود کے ناپسندیدہ ہونے کا اظہار تو ہجرت سے پہلے مکے ہی میں کیا جا چکا تھا (ملاحظہ ہو سورۂ روم، رکوع ۴) اب اس کی قانونی ممانعت کی ابتدا ہوتی ہے اور سب سے پہلے شرح سود پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ عرب میں سود در سود کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی شخص ایک خاص شرح سود پر کسی سے قرض لیتا اور مدتِ مقررہ پوری ہونے تک اسے ادا نہ کرتا تو اس کو مزید مہلت دینے کے لیے شرح سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ دوسری یہ کہ ایک مدت تک جب سود ادا نہ ہوتا تو وصول طلب سود کو اصل میں شامل کر کے پھر اس پر سود لگا دیا جاتا۔ اس موقع پر صرف اسی نوعیت کے معاملات کو حرام کیا گیا۔ سود کی کلی ممانعت (جس کا حکم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے) اس کے چند سال بعد ہوئی جبکہ تقریباً پورا ملکِ عرب اسلام کے زیرنگیں آچکا تھا اور ملک کے معاشی نظام کو بالکلیہ بدل دینا ممکن ہو گیا تھا۔

۵۳؎ سود خواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے اس کے اندر سود خواری کی وجہ سے (باقی اگلے صفحہ پر)

جو گناہ معاف کرسکتا ہو ـــ اور دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔[1] ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔

تم سے پہلے بہت سے دور گذر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔[2] یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کیلیے ہدایت اور نصیحت۔ دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔[3] یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں۔[4] کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ـــ اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے سچے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ

(بقیہ سابق) دو قسم کے اخلاقی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ سود لینے والوں میں حرص و طمع، بخل اور خود غرضی۔ اور سود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور ناراضی۔ احد کی شکست میں ان تمام اثرات کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ سود خواری سے فریقین میں جو اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں ان کے بالکل برعکس انفاق فی سبیل اللہ سے یہ دوسری قسم کے اوصاف پیدا ہوا کرتے ہیں اور اللہ کی بخشش اور اس کی جنت اسی دوسری قسم کے اوصاف سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] جو لوگ اب تک سود در سود کا ظالمانہ کاروبار کرتے رہے ہیں ان کو امید دلائی جا رہی ہے کہ اگر تم اب یہ جان لینے کے بعد کہ اللہ کو یہ کاروبار پسند نہیں ہے اس سے باز آجاؤ اور اپنے گناہ پر اصرار نہ کرو تو پہلے جو کچھ کرتے رہے ہو اسے اللہ معاف کر دیگا۔

[2] یہ تنبیہ ہے اس بات پر کہ اگر اللہ کا حکم سن لینے کے بعد بھی تم وہی کچھ کرتے رہے جو اب تک کرتے رہے ہو تو اس انجام کے لیے تیار ہو جاؤ جو تم سے پہلے نافرمانوں کا ہو چکا ہے۔

[3] اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف۔ اور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمت نہ ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمت ہارو۔

[4] اصل الفاظ ہیں ویتخذ منکم شھداء۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزت بخشنا چاہتا تھا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اور منافقین کے اس مخلوط گروہ میں سے جس پر تم اس وقت مشتمل ہو، ان لوگوں کو الگ چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شھداء علی الناس ہیں، یعنی اس منصب جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے اُمت مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔

تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں؟ تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے! مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آ گئی اور تم نے اسے آنکھوں دیکھ لیا۔[۱۰۱]

محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟[۱۰۲] یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔

کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔[۱۰۳] جو شخص ثواب دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت[۱۰۴] کے ارادہ سے کام

---

۱۰۱ اشارہ ہے شہادت کے اُن تمنائیوں کی طرف جن کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔

۱۰۲ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر صحابہ کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ اس حالت میں منافقین نے (جو مسلمانوں کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے) کہنا شروع کیا کہ چلو عبداللہ بن اُبی کے پاس چلیں تاکہ وہ ہمارے لیے ابو سفیان سے امان لے دے۔ اور بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر محمدؐ خدا کے رسول ہوتے تو قتل کیسے ہوتے، چلو اب دین آبائی کی طرف لوٹ چلیں۔ انہی باتوں کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہاری "حق پرستی" محض محمدؐ کی شخصیت سے وابستہ ہے اور تمہارا اسلام ایسا سست بنیاد ہے کہ محمدؐ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اسی کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے تو اللہ کے دین کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

۱۰۳ اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمہارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔ لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی کرنی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت بھی تمہیں حاصل ہے اس میں تمہاری سعی و جہد کا مقصود کیا ہے، دنیا یا آخرت؟

۱۰۴ ثواب کے معنی ہیں نتیجۂ عمل۔ ثوابِ دنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجہ میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں۔ اور ثوابِ آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے[۹] والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے[۱۰]۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ "مالک! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اُسے

(بقیہ سابق) آخرت کی پائیدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اخلاق کے معاملہ میں فیصلہ کن سوال یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں آدمی جو دوڑ دھوپ کر رہا ہے اس میں آیا وہ دنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اُخروی نتائج پر۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۹] "شکر کرنے والوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اِس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اُس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انھیں دنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالم کی خبر دی اور انھیں اس حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اِس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اِس زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ یہ وسعتِ نظر اور یہ دوربینی و عاقبت اندیشی حاصل ہو جانے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اس دنیوی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں بارآور ہوتے نہ دیکھے، یا ان کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے اور اس کے باوجود اللہ کے بھروسہ پر وہ کام کرتا چلا جائے جس کے متعلق اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہرحال آخرت میں اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا، وہ شکر گزار بندہ ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اِس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا رہیں جن کا حال یہ ہو کہ دنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے نظر آئیں ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جُھک پڑیں اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بارآور ہونے کی امید نہ ہو یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اُن میں آخرت کے نتائج خیر کی امید پر اپنا وقت، اپنے مال اور اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ ناشکرے ہیں اور اُس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے انھیں بخشا ہے۔

[۱۰] یعنی اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور زورآوری دیکھ کر انھوں نے باطل پرستوں کے آگے سپر نہیں ڈالی۔

معاف کردے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر"۔ آخرکار اللہ نے ان کو
دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔ ع

اے ایمان لانے والو! اگر تم اُن لوگوں کے اشاروں پر چلوگے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار
کی ہے تو وہ تم کو اُلٹا پھیر لے جائیں گے[1] اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (ان کی باتیں غلط ہیں، حقیقت یہ
ہے کہ اللہ تمھارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے
جب ہم منکرینِ حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اُن کو خدائی
میں شریک ٹھیرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اُن کا آخری ٹھکانا جہنم
ہے اور کیسی بُری قیام گاہ ہے جو ان ظالموں کو نصیب ہو گی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم
سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے، مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ
وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی
خلاف ورزی کر بیٹھے ــــ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش
رکھتے تھے ــــ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق
یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا[2] کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔ (ذرا یاد

[1] یعنی جس کفر کی حالت سے تم نکل کر آئے ہو اسی میں یہ تمھیں پھر واپس لے جائیں گے۔ منافقین اور یہودی اُحد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ محمدؐ اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں، ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے۔ آج فتح ہے تو کل شکست۔ خدا کی جس حمایت و نصرت کا انھوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔

[2] یعنی تم نے غلطی تو ایسی کی تھی کہ اگر اللہ تمھیں معاف نہ کر دیتا تو اس وقت تمھارا استیصال ہو جاتا۔ یہ اللہ کا فضل تھا اور اس کی تائید و حمایت تھی جس کی بدولت تمھارے دشمن تم پر قابو پا لینے کے بعد ہوش گم کر بیٹھے اور بلاوجہ خود پسپا ہو کر چلے گئے۔

کرو (وہ وقت) جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا اور رسول تمھارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔[1] اس وقت تمھاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمھیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے[2] تاکہ آئندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے اور جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اُس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔[3] مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلافِ حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں" دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں اُسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے"۔ ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے"

---

[1] جب مسلمانوں پر عقب سے اور سامنے سے بیک وقت حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی تو کچھ لوگ مدینہ کی طرف بھاگ نکلے اور کچھ اُحد پر چڑھ گئے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی۔ مگر اللہ کا رسول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا الیّ عباداللہ، الیّ عباداللہ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ، اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔

[2] رنج ہزیمت کا، رنج اس خبر کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، رنج اپنے کثیر التعداد مقتولوں اور مجروحوں کا، رنج اس بات کا کہ اب گھروں کی بھی خیر نہیں، تین ہزار دشمن، جن کی تعداد مدینہ کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے شکست خوردہ فوج کو روندتے ہوئے قصبہ میں آ گھسیں گے اور سب کو تباہ کر دیں گے۔

[3] یہ ایک عجیب تجربہ تھا جو اُس وقت لشکرِ اسلام کے بعض لوگوں کو پیش آیا۔ حضرت ابوطلحہ جو اس جنگ میں شریک تھے خود بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہم پر اُونگھ کا ایسا غلبہ ہو رہا تھا کہ تلواریں ہاتھ سے چھوٹی پڑتی تھیں۔

اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اُسے آزما لے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اُسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگذر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

اے ایمان لانے والو! کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[1]، ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمھاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصہ میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔

(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ اِن کے قصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، البتہ جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسہ

---

[1] یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قضاء الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی، مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ اپنی تدبیروں ہی پر موقوف سمجھتے ہیں ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش یوں ہوتا تو یہ ہو جاتا۔

پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے[۱]۔ اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا وہ بدترین ٹھکانا ہو جسے جہنم کہتے ہیں؟ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اُس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ

---

[۱] جن تیراندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا انھوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا لشکر لٹا جا رہا ہے تو اُن کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انھی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقع پر محروم نہ رکھے جائیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپ نے اُن لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عُذرات پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضور نے فرمایا بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم "اصل بات یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمہارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہیں دیں گے"۔ اس آیت کا اشارہ اسی معاملہ کی طرف ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہاری فوج کا کمانڈر خود اللہ کا نبی تھا اور سارے معاملات اس کے ہاتھ میں تھے تو تمہارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کیسے ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں تمہارا مفاد محفوظ نہ ہوگا۔ کیا خدا کے پیغمبر سے یہ توقع رکھتے ہو کہ جو مال اس کی نگرانی میں ہو وہ دیانت، امانت اور انصاف کے سوا کسی اور طریقہ سے بھی تقسیم ہو سکتا ہے؟ (باقی اگلے صفحہ پر)

بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑ چکی ہے[۵۴]۔ اے نبی! ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے[۵۵]، اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۵۶]، جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اِذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔ وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے[۵۷]۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اِن کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے

(بقیہ سابق) ۵۳؎ اکابر صحابہ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوسکتے تھے، مگر عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ جب اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے تو کسی حال میں کفار ہم پر فتح پا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب اُحد میں ان کو شکست ہوئی تو ان کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے حیران ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا؟ اللہ کے دین کی خاطر ہم لڑیں، اللہ کا وعدۂ نصرت ہمارے ساتھ ہو، اللہ کا رسول خود میدانِ جنگ میں موجود ہو اور پھر بھی ہم شکست کھائیں؟ اور شکست بھی اُن سے جو اللہ کے دین کو مٹانے آئے ہوں؟ یہ آیات اسی حیرانی کو دور کرنے کیلیے ارشاد ہوئی ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۴؎ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے ۷۰ آدمی شہید ہوئے۔ بخلاف اس کے جنگِ بدر میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ۷۰ آدمی گرفتار ہو کر آئے تھے۔

۵۵؎ یعنی یہ تمہاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزاع و اختلاف کیا، پھر کیوں پوچھتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی؟

۵۶؎ یعنی اللہ اگر تمھیں فتح دینے کی قدرت رکھتا ہے تو شکست دلوانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

۵۷؎ عبداللہ بن اُبَی جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستہ سے پلٹنے لگا تو بعض مسلمانوں نے جا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے اُسے ٹال کر دکھا دینا۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں[۱]، اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں اُن کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شادان و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ع۱۷

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے[۲]۔ اور وہ جن سے[۳] لوگوں نے کہا کہ "تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو"، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے

(بقیہ سابق) آج جنگ نہیں ہوگی، اس لیے ہم جا رہے ہیں، ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] مسند احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص نیک عمل لیکر دنیا سے جاتا ہے اسے اللہ کے ہاں اس قدر پُرلطف اور پُرکیف زندگی میسر آتی ہے جس کے بعد وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی تمنا نہیں کرتا، مگر شہید اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ تمنا کرتا ہے کہ پھر دنیا میں بھیجا جائے اور پھر اُس لذت، اُس سرور اور اُس نشے سے بہرہ یاب ہو جو راہِ خدا میں جان دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

[۲] جنگِ اُحد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دور چلے گئے تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے آپس میں کہا یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا اُسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھیر کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔ لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ گمان تھا کہ یہ لوگ شاید پھر نہ پلٹ آئیں۔ اس لیے جنگِ اُحد کے دوسرے ہی دن آپ نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخرکار وہ اللہ کی عنایت سے اِس طرح پلٹ آئے کہ ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انھیں حاصل ہوگیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمھیں معلوم ہوگیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں کو خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو۔

(اے پیغمبرؐ) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے،

(بقیہ سابق) مسلمانوں کو جمع کرکے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے وہ جان نثار کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس آیت کا اشارہ انہی فداکاروں کی طرف ہے۔

۱۲؎ یہ چند آیات جنگِ احد کے ایک سال بعد نازل ہوئی تھیں مگر چونکہ ان کا تعلق اُحد ہی کے سلسلۂ واقعات سے تھا اس لیے ان کو بھی اس خطبہ میں شامل کردیا گیا۔ اُحد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان چیلنج دے گیا تھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا۔ مگر جب مقابلہ کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا کیونکہ اُس سال مکہ میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا جس نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کرسکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہوکر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلہ پر نہ آنے کی ذمہ داری انھی پر رہے۔ ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخرکار اللہ کے رسول نے بھرے مجمع میں اعلان کردیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر [illegible] فداکار آپ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہوگئے اور آپ انھی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ اُدھر ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا مگر دو روز کی مسافت تک جاکر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آئندہ سال آئیں گے۔ چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی واپس ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے اور اس دوران میں آپ کے ساتھیوں نے ایک تجارتی قافلہ کر (باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ باالآخران کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں (آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں) اور ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر ان کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دیگا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو[۱۱]۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے[۱۲]۔ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خداترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے[۱۳] اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ع

(بقیہ سابق) کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اٹھایا۔ پھر جب یہ خبر معلوم ہو گئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۱] یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچے اہل ایمان اور منافق، سب خلط ملط ہیں۔

[۱۲] یعنی مومن و منافق کی تمیز نمایاں کرنے کے لیے اللہ یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ غیب سے تم کو دلوں کا حال بتا دے کہ فلاں مومن ہے اور فلاں منافق، بلکہ اس کے حکم سے ایسے امتحان کے مواقع پیش آئیں گے جن میں تجربہ سے مومن اور منافق کا حال کھل جائیگا۔

[۱۳] یعنی زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے وہ دراصل اللہ کی ملک ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ نے اُن لوگوں کا قول سُنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں[1]۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اُس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو اب عذاب جہنم کا مزا چکھو، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھائے[2]" اُن سے کہو تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو اُن کو تم نے کیوں قتل کیا؟ اب اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔ آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو، لہٰذا اصلی کامیابی اس کی ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے[3]۔

(بقیہ سابق) اور اس پر مخلوق کا قبضہ و تصرف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہر حال بے دخل ہونا ہے اور آخر کار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانے والا ہے۔ لہٰذا عقلمند ہے وہ جو اس عارضی قبضہ کے دوران میں اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے اور سخت بے وقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ یہودیوں کا قول ہے۔ قرآن مجید کی آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے) پر طعن کرتے ہوئے وہ اس قسم کی باتیں کہا کرتے تھے۔

[2] یعنی وہ ہمارے سامنے کسی جانور کو قربان کرے اور ہماری آنکھوں دیکھتے ایک آگ غیب سے نمودار ہو کر اسے بھسم کر ڈالے جس سے ثابت ہو کہ واقعی یہ شخص خدا کی طرف سے آیا ہے۔

[3] یعنی اس دنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں انہی کو اگر کوئی شخص اصلی اور آخری نتائج (باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو[۱] تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ ان اہلِ کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا[۲]۔ مگر انھوں نے کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اُسے بیچ ڈالا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف انھیں حاصل ہو جو فی الواقع انھوں نے نہیں کیے ہیں[۳]۔ حقیقت میں ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ زمین اور آسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ ۱۹ع

زمین[۴] اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی

(بقیہ صفحہ سابق) سمجھ بیٹھے اور انھیں حق و باطل اور فلاح و خسران کا معیار قرار دے لے تو درحقیقت وہ سخت دھوکہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر بھی ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردودِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلہ کے نتائج اُن آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیاتِ ابدی کے مرحلہ میں پیش آنے والے ہیں اور اصل اعتبار اُنھی نتائج کا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی ان کے طعن و تشنیع، ان کے الزامات، ان کے بیہودہ طرزِ کلام اور ان کی جھوٹی نشر و اشاعت کے مقابلہ میں بے صبر ہو کر تم ایسی باتوں پر نہ اُتر آؤ جو صداقت و انصاف، وقار و تہذیب اور اخلاقِ فاضلہ کے خلاف ہوں۔

[۲] یعنی انھیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی، مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کے سپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمتِ عظمیٰ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔

[۳] مثلاً کہا جائے کہ حضرت بڑے متقی ہیں، دیندار اور پارسا ہیں، خادمِ دین ہیں، حامیِ شرعِ متین ہیں، مُصلح و

(باقی اگلے صفحہ پر)

ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں[۱۲۴]۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اُسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا[۱۲۵]۔ مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی[۱۲۶]، پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگذر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انھیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے[۱۲۷]۔" (جن لوگوں نے یہ دعا کی) ان کو ان کے رب کی طرف سے جواب ملا کہ "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو[۱۲۸]۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے گھر بار چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے اور ستائے گئے اور جو میرے لیے لڑے

(بقیہ سابق) مرتے ہیں، حالانکہ حضرت کچھ بھی نہیں۔

۱۲۲ یہ خاتمہ کلام ہے۔ اس کا ربط اوپر کی قریبی آیات میں نہیں بلکہ پوری سورۃ میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کو سمجھنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ سورۃ کی تمہید کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۲۳ یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو، اور آثار کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔

۱۲۴ یعنی جب وہ نظام کائنات کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کھل جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے، اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حس پیدا کی ہو، جسے تصرف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو، اس سے اس کی حیات دنیا کے اعمال پر باز پرس نہ ہو، اور اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح انھیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور مارے گئے ان کے سب قصور معاف کر دوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے[۱۰]۔

دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اُس ہدایت پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس ہدایت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔

اے ایمان لانے والو! صبر سے کام لو، باطل کے مقابلہ میں قدم مضبوط رکھو اور حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ ع ۲۰

(بقیہ سابق) ۳ ؎ اسی طرح یہی مشاہدہ اُن کو اس بات پر بھی مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں وہ سراسر حق ہے۔

۴ ؎ یعنی انھیں اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں، البتہ تردد اس امر میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں، اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا مصداق ہمیں بنا دے اور ہمارے ساتھ انھیں پورا کر، ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبر پر ایمان لا کر کفار کی تضحیک و طعن و تشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں، قیامت میں بھی ان کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو۔

۵ ؎ یعنی تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو، میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱۰ ؎ روایت ہے کہ بعض غیر مسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ عصا اور ید بیضا لائے تھے، عیسیٰ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے، دوسرے پیغمبر بھی کچھ نہ کچھ معجزے لائے تھے، آپ فرمائیں کہ آپ کیا لاتے ہیں؟ اس پر آپ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں اور ان سے کہا کہ میں یہ لایا ہوں۔

مقالات

اسلام میں مرتد کا حکم

کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغِ کفر کی اجازت ہے؟

۲۔ دارالاسلام میں تبلیغِ کفر کا مسئلہ یہاں تک ہماری بحث پہلے سوال سے متعلق تھی یعنی یہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں۔ اب ہم دوسرے سوال کو لیتے ہیں جسے سائل نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> "کیا ایک صحیح اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق اسی طرح ہوگا جس طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہیے؟ کیا خلافتِ راشدہ اور بعد کی خلافتوں کے تحت کفار و اہلِ کتاب کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق حاصل تھا؟"

اس مسئلہ کا فیصلہ بڑی حد تک تو قتلِ مرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے، کیونکہ جب ہم اپنے حدودِ اقتدار میں کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا "حق" نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم حدودِ دارالاسلام میں اسلام کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کے اُٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ دوسرے مذاہب و مسالک کو تبلیغ کا "حق" دینا، اور مسلمانوں کے لیے تبدیلِ مذہب کو جرم ٹھیرانا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور موخر الذکر قانون مقدم الذکر چیز کو خود بخود کالعدم کر دیتا ہے۔ لہٰذا قتلِ مرتد کا قانون فی نفسہٖ یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام اپنے حدودِ اقتدار میں تبلیغِ کفر کا روادار نہیں ہے لیکن ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ قانون صرف مسلمانوں کو تبلیغِ کفر کے اثرات سے محفوظ کرتا ہے، اس کے بعد یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ آیا اسلام اپنے حدود میں رہنے والے غیر مسلموں اور باہر سے آنے والے داعیوں کو غیر مسلم آبادی میں اپنے اپنے مذاہب و مسالک کی دعوت پھیلانے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟

مسئلہ کی تحقیق۔ اس سوال کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی پوزیشن اور اسلامی حکومت کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

اسلام کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ وہ خود ایک راستہ نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرتا ہے اور پوری قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہی میرا راستہ صحیح ہے اور دوسرے سب راستے غلط ہیں، اسی میں انسان کی فلاح ہے اور دوسرے راستوں میں انسانیت کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا اسی راہ پر سب لوگوں کو آنا چاہیے اور دوسرے راستوں کو چھوڑ دینا چاہیے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ۔ (الانعام - ۱۹)

اور یہ کہ میرا یہ راستہ ہی ایک سیدھا راستہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو ورنہ تم اللہ کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

اُس کی نگاہ میں ہر وہ طریقِ فکر و عمل جس کی طرف کوئی غیر مسلم دعوت دیتا ہے، گمراہی ہے اور اس کی پیروی کا نتیجہ انسان کے لیے نقصان اور خالص نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہے:

اُولٰٓئِكَ یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (البقرہ - ۲۷)

وہ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔

اِس دعویٰ اور اِس دعوت میں اسلام اپنے اندر کوئی باطنی تذبذب اور تردد نہیں رکھتا۔ وہ اِس شک میں مبتلا نہیں ہے کہ شاید کوئی دوسرا راستہ بھی حق اور موجبِ فلاحِ انسانیت ہو، اسے اپنے حق اور دوسری تمام راہوں کے باطل ہونے کا پورا یقین ہے۔ پس جبکہ اسلام کی پوزیشن یہ ہو تو اس کی طرف سے یہ ایک متناقض طرزِ عمل ہوگا کہ وہ ایک طرف دوسرے تمام راستوں کے باطل ہونے کا دعویٰ اس قدر یقین کے ساتھ بھی کرے اور دوسری طرف گمراہ لوگوں کے اس حق کو بھی تسلیم کرے کہ وہ بندگانِ خدا کو ان باطل راستوں کی طرف بلائیں۔ دعوت و تبلیغ کا "حق" تو بڑی چیز ہے، اس کی پوزیشن تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی غیر مسلم کے لیے دہریت یا کفر یا شرک پر قائم رہنے کو اس کا "حق" تسلیم کرلے۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کو وہ بادلِ ناخواستہ گوارا کرتا ہے وہ بس یہ ہے کہ جو شخص کفر پر قائم رہنا چاہتا ہے اسے "اختیار" ہے کہ اپنی فلاح کے راستہ کو چھوڑ کر اپنی بربادی کے راستہ پر چلتا رہے۔ اور یہ بھی وہ صرف اس لیے گوارا کرتا ہے کہ زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں ہے، ورنہ انسانیت کی خیر خواہی کا اقتضا یہ تھا کہ اگر کفر کے زہر سے لوگوں کو بجبر بچانا ممکن ہوتا تو ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا جاتا جو اس زہر کا پیالہ پی رہا ہے۔ اس جبری حفاظت

اور نجات دہندگی سے اسلام کا اجتناب اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ تباہی کے گڑھے کی طرف جانے کو لوگوں کا "حق" سمجھتا ہے اور انھیں روکنے اور بچانے کو "باطل" خیال کرتا ہے، بلکہ اس کا جبر سے اس کے اجتناب کی وجہ صرف یہ ہے کہ خدا نے جس قانون پر کائنات کا موجودہ نظام بنایا ہے اس کی رو سے کوئی شخص کفر کے تباہ کن نتائج سے نہیں بچایا جا سکتا جب تک کہ وہ خود کافرانہ طرز فکر و عمل کی غلطی کا قائل و معترف ہو کر مسلمانہ رویہ اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اس لیے اور صرف اسی لیے اسلام اللہ کے بندوں کو یہ "حق" نہیں بلکہ "اختیار" دیتا ہے کہ وہ تباہی و بربادی ہی کے راستہ پر چلنا چاہتے ہیں تو چلیں لیکن اس سے یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اس اختیار کے ساتھ ان خودکشی کرنے والوں کو یہ بھی اختیار دے گا کہ جس تباہی کی طرف وہ خود جا رہے ہیں اس کی طرف دوسرے بندگان خدا کو بھی چلنے کی ترغیب دیں۔ جہاں اس کا بس نہیں چلتا وہاں تو وہ مجبور ہے لیکن جہاں اس کی اپنی حکومت قائم ہو اور اللہ کے بندوں کی فلاح و بہبود کا ذمہ اس نے لیا ہو وہاں چوری اور ڈاکے اور قحبہ گری اور افیون نوشی اور زہر خوری کی تبلیغ کا لائسنس دینا اگر اس کے لیے ممکن نہیں ہے تو اس سے بدرجہا زیادہ مہلک چیز کفر و شرک اور دہریت اور خدا سے بغاوت کی تبلیغ کا لائسنس دینا اس کے لیے کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟

اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد اسلام جس غرض کے لیے اپنی حکومت قائم کرتا ہے وہ محض انتظام ملکی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک واضح اور متعین مقصد ہے جسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (التوبہ ـ ۵)	وہ اللہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔
وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال ـ ۵)	اور تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ـ ۱۷)	اور اسی طرح تو ہم نے تم کو امت وسط (بہترین گروہ) مقرر کیا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو

ان آیات کی رو سے پیغمبر کے مشن کا اصل مدعا یہ ہے کہ جس ہدایت اور دین حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے

ہر اُس نظامِ زندگی کے مقابلہ میں غالب کرے جو دین کی نوعیت رکھتا ہو، اور لامحالہ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جہاں پیغمبر کو اپنے اس مشن میں کامیابی حاصل ہو جائے وہاں وہ کسی ایسی دعوت کو نہ اُٹھنے دے جو خدا کی ہدایت اور اس کے دین کے مقابلہ میں کسی دوسرے دین یا نظامِ زندگی کے غلبہ کی کوشش کرنا چاہتی ہو۔ پیغمبر کے بعد جس طرح اس کے جانشین اس دین کے وارث ہوتے ہیں جو وہ خدا کی طرف سے لایا تھا، اسی طرح وہ اس مشن کے بھی وارث ہوتے ہیں جس پر اللہ نے اسے مامور کیا تھا۔ ان کی تمام جدوجہد کا مقصود ہی یہ قرار پاتا ہے کہ دین پورا کا پورا اللہ کے لیے مخصوص ہو۔ جہاں معاملاتِ زندگی ان کے قبضہ و اختیار میں آجائیں اور جس ملک یا جس سرزمین کے انتظام کے متعلق انھیں پوری طرح خدا کے سامنے ذمہ دار بن کر گواہی دینی ہو وہاں ان کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی حفاظت و نگرانی میں خدا کے دین کے بالمقابل کسی دوسرے دین کی دعوت کو پھیلنے کا موقع دیں تاکہ دین پورا کا پورا اللہ کے لیے نہ ہونے پائے اور کسی غلط نظامِ زندگی کا فتنہ اگر باقی ہے تو وہ اور زیادہ بڑھے۔ آخر وہ خدا کے سامنے گواہی کس چیز کی دیں گے؟ کیا اس چیز کی کہ جہاں تو نے ہمیں حکمرانی کی طاقت بخشی تھی وہاں ہم تیرے دین کے مقابلہ میں ایک فتنے کو سر اٹھانے کا موقع دے آئے ہیں؟

دار الاسلام میں ذمیوں اور مستامنوں کی حیثیت

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو اپنے دین پر قائم رہنے کی جو آزادی بخشی گئی ہے اور جزیہ کے معاوضہ میں ان کی جان و مال اور ان کی مذہبی زندگی کے تحفظ کا جو ذمہ لیا گیا ہے اس کا مآل زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہے کہ جس طریقہ پر وہ خود چلنا چاہتے ہیں اس پر چلتے رہیں۔ اس سے تجاوز کر کے اگر وہ اپنے طریقہ کو دنیا میں پھیلانے کی کوشش کریں گے تو کوئی اسلامی حکومت جو اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہو، انھیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔ جزیہ کا قانون قرآن مجید کی جس آیت میں بیان ہوا ہے اس کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں)۔ اس آیت کی رو سے ذمیوں کی صحیح پوزیشن اسلامی حکومت میں یہ ہے کہ وہ صاغرون بنے رہنے پر راضی ہوں۔ کابرون بننے کی کوشش وہ ذمی ہوتے ہوئے نہیں کر سکتے۔ اسی طرح باہر سے آنے والے غیر مسلم جو مستامن کی حیثیت سے دار الاسلام میں داخل ہوں، تجارت، صنعت و حرفت، سیاحت، حصولِ تعلیم، اور دوسرے تمام تمدنی مقاصد کے لیے آسکتے ہیں، لیکن اس غرض کے لیے ہرگز نہیں آسکتے کہ اللہ کے کلمہ کے مقابلہ میں

کوئی دوسرا کلمہ بلند کریں، اللہ نے کفار کے خلاف جو مدد اپنے پیغمبر کو اور اس کے بعد مسلمانوں کو دی یا آئندہ دیگا، اور جس کے نتیجہ میں دارالاسلام پہلے قائم ہوا یا آئندہ کبھی قائم ہوگا، اس کی غرض صرف یہ تھی اور آئندہ بھی یہی ہوگی کہ کافروں کا بول نیچا ہو اور اللہ کا بول بالا ہو کر رہے، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا پس مسلمان محض احسان فراموش اور کافر نعمت ہوں گے اگر اللہ کی اس مدد کا فائدہ اٹھانے کے بعد وہ اپنی حدود اختیار میں كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا کو سفلیٰ سے پھر علیا ہونے کے لیے کوشش کرنے دیں۔

دور نبوت اور خلافت راشدہ کا طرز عمل

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں حکومت کی مستقل پالیسی یہی تھی جو اوپر بیان ہوئی عرب میں مسیلمہ، اسود عنسی، طلیحہ اسدی، سجاح، لقیط بن مالک ازدی اور ان کے سوا جو بھی اسلام کے مقابلہ پر کوئی دعوت لیکر اٹھا، اسے بزور دبا دیا گیا۔ جن غیر مسلم قوموں نے جزیہ پر معاہدہ کر کے اسلامی حکومت میں ذمی بن کر رہنا قبول کیا ان میں سے اکثر کے معاہدے لفظ بلفظ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، ان میں تمام حقوق و مراعات کی تفصیل پائی جاتی ہے مگر اس "حق" کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ وہ اپنے دین کی دعوت حدود دارالاسلام میں پھیلا سکیں گی۔ جن غیر مسلموں کو مسلمانوں نے خود اپنی فیاضی سے ذمیت کے حقوق عطا کیے، ان کے حقوق کی تفصیل بھی فقہ کی کتابوں میں موجود ہے مگر اس نام نہاد "حق" کے ذکر سے وہ بھی خالی ہیں۔ مستامن بن کر باہر سے آنے والے غیر مسلموں کے ساتھ حکومت اسلامی کا معاملہ جیسا کچھ بھی ہونا چاہیے اس کو فقہاء نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں بھی کہیں کوئی اشارہ تک ہمیں ایسا نہیں ملتا کہ اسلامی حکومت کسی ایسے شخص کو آکر اپنے حدود میں کام کرنے کی اجازت دے سکتی ہے جو کسی دوسرے مذہب یا مسلک کا پرچار کرنا چاہتا ہو۔ اب اگر بعد کے دنیا پرست "خلفاء" اور بادشاہوں نے اس کے خلاف کوئی عمل کیا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اسلام کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ وہ دراصل اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ایک حقیقی اسلامی حکومت کے فرائض سے ناواقف یا ان سے منحرف ہو چکے تھے۔ "رواداری" کے موجودہ تصور کو جن لوگوں نے معیار حق سمجھ رکھا ہے وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے بادشاہوں کے یہ کارنامے داد طلبی کے لیے غیر مسلموں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کہ فلاں مسلمان بادشاہ نے غیر مسلم معبدوں اور مدرسوں کے لیے اتنی جائدادیں وقف کیں، اور فلاں کے دور میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنے اپنے دین کے پرچار کی پوری آزادی حاصل تھی۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب کارنامے ان بادشاہوں کے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

(باقی)

مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی)

مسلمانوں پر تنقید کرنا اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنا کسی مسلمان کے لیے قطعاً کوئی خوش گوار کام نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی شخص آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا لیکن دنیا کے سب ضروری کام خوشگوار نہیں ہوتے۔ ایک ایسی جماعت کی کمزوریوں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا جس سے نہ صرف اس کی اپنی قسمت بلکہ دنیا کی قسمت بھی وابستہ ہے اور جو انجیل کی زبان میں زمین کا نمک ہے جس کی نمکینی کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر زمین کو کوئی چیز نمکین نہیں کرسکتی، ایک ایسا ناخوش گوار کام ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر ناگواری، ہر تلخی، ہر طرح کی روحانی اذیت اور ہر قسم کی ذہنی کوفت ہیچ ہے، اور اس کے مقابلہ میں اپنی یا دوسروں کی یہ ناخوش گواری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی کسی قوم یا ملک کا سلطنت و اقتدار سے محروم ہو جانا، یا مسلمانوں کا عالمگیر سیاسی زوال بہت بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس کے جو اخلاقی اور ذہنی نتائج ہوتے ہیں، وہ بھی اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے۔ لیکن اس سے بدرجہا المناک حادثہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی ذہنیت یا نفسیت کسی ایسے سانچہ میں ڈھلنے لگے جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا سانچہ نہیں ہے، اور بعض انفرادی عیوب و نقائص یا منکرِ خدا اور منکرِ آخرت قوموں کے صفات و خصائص مسلمانوں کی سیرت کا جزء بننے لگیں اور قومی کیرکٹر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ تحریفِ دین کی اصطلاح تو پہلے سے موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عملی کوتاہیوں اور ذاتی انحراف سے بڑھ کر کوئی جماعت اصلِ دین، اس کی کتابوں اور اس کی تعلیمات میں ترمیم و تنسیخ اور رد و بدل شروع کر دے۔ اس کے نتائج انحراف سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور وسیع ہوتے ہیں، اور اس کا علاج اور اس صورتِ حال کی اصلاح تقریباً محال ہوتی ہے، اس لیے کہ اس

تحریف سے اس قوم کے ذہن میں حقائق بدل جاتے ہیں، گناہ عین صواب اور بعض اوقات کار ثواب بن جاتا ہے اور ان کو دین کی اصل وحقیقت سے ہٹ جانے یا دور پڑ جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہی عین دین معلوم ہوتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں مذہبی طور پر یہی صورت پیش آئی ہے۔ میں اس تحریف دین کے مقابلہ میں اس ذہنی واخلاقی تبدیلی کو جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آرہی ہے تحریف مسلمین سے تعبیر کروں گا۔ مسلمانوں میں عملی کوتاہیاں کم وبیش ہمیشہ پائی گئیں اور انسانوں کی کسی جماعت کا ان سے یکسر پاک ہونا بہت مستبعد ہے۔ لیکن یہ انحراف تھا۔ مسلمان اس کو غلط سمجھتے رہے اور اسلامی ذہن وضمیر ہمیشہ اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا، اور کبھی مسلمانوں نے اس پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اب جو کچھ نظر آرہا ہے اس کو انحراف کہنا مشکل ہے، وہ اس سے کچھ زیادہ وسیع اور عمیق اور اس سے مختلف شکل رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام سیاسی تعلیمی اور اقتصادی مسائل سے زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے۔ قومی کیرکٹر ہر قوم کی زندگی میں اس کی مادی دولتوں سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت ہوتا ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی اسلامی سیرت، بڑی سے بڑی اسلامی سلطنت اور بڑے سے بڑے قومی ادارہ اور زیادہ سے زیادہ قومی ترقی اور اقتصادی خوش حالی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی قیمت اور عظیم سے عظیم بدل پر بھی اس کے نقصان یا زوال کو گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس پر زوال آگیا یا اس میں کچھ غلط تبدیلی واقع ہوگئی تو بڑی سے بڑی مادی کامیابی اور فتح سے اس کا کفارہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تبدیلی مختلف تاریخی وسیاسی وتعلیمی وتہذیبی اسباب، بعض موثر اور اشتعال انگیز حالات وواقعات اور زیادہ تر قیادت کی کمزوری سے صدیوں میں پیش آتی ہے۔ لیکن جب بدقسمتی سے یہ تبدیلی واقع ہوجاتی ہے تو صدیوں تک اس کا اثر قائم رہتا ہے اور اس کے اخلاقی واجتماعی نتائج اس قوم کے تمام افراد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں خواہ انفرادی طور پر بعض افراد کتنے ہی نیک سیرت ہوں۔

اس موقع پر چند نمایاں کمزور پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دینی واخلاقی حیثیت سے زیادہ اہمیت

رکھتے ہیں اور جن کو اصل اسلامی سیرت اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ بُعد اور تعارض ہے۔

(۱) ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر پائدار مستقل اصول اور صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح، آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اُس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں (جو کسی طرح یورپ کے زیرِ اثر آئے) مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانہ کا ہر واقف آدمی جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ "افادیت" اور "مصلحت بینی" اس نظامِ زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ سارا یورپ اُس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کرایا صرف ایک ہی عملی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں ہوئی) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں (میں جہاں یہ نظام اپنی پوری روح کے ساتھ مستولی ہے) معدوم ہو گئی ہے۔ دنیاوی ترقی اور مادی فوائد و منافع منتہائے نظر بن گئے ہیں۔ اصولی و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلہ میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور اس شدومد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلاارادہ آخرت اور امورِ آخرت کی اہمیت کم ہو گئی، بلکہ بعض اوقات انھوں نے اس نظام اور ان افکار کی تضحیک و تنقیص

کی جس میں دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی اور مسلمانوں کو دنیا پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُن جملوں اور اُن تقریروں اور تحریروں کا مذاق اُڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاعِ قلیل اور متاعِ غرور کہا گیا تھا۔ دنیا پرست، مادہ پرست اور منکرِ آخرت قوموں اور ملکوں (غالباً صحیح تر ایک قوم اور ملک) کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظامِ تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی روح لبی ہوئی تھی۔ اس کی اساس اخلاق کے مقابلہ میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی، اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلہ میں خواہشِ نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا۔ وہ تمام تر ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار تھا جو سرتاپا منکرِ آخرت تھی۔ دراصل یہ کسی مجرد نظامِ تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفۂ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"،

اور ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

اس دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بتدریج گھٹتی چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصالح کو اصول پر ترجیح حاصل تھی۔ وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم اور اخلاقی تعلیم کو ایک شخصی منفعت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کے ساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے اس نصفِ اول میں ہندوستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیرکٹر میں

پہلے کے مقابلہ میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آرہا ہے، جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لیے حد درجہ تشویش ناک ہے۔ اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلہ میں ذاتی ترقی یا شخصی فوائد کی قربانی کی مثالیں کم سے کم تر نظر آتی ہیں اور وہ بھی زمانہ گذشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر رو بزوال ہیں۔ اب تمام مسائل زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طریق فکر اور زاویۂ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اس کے لیے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و اعزاز حاصل ہوگا اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس کے لیے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے بالکل نکلتے جارہے ہیں یا ان کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور ان کی بنا پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب و ضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے خواہ وہ شریعت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً حد درجہ معیوب ہو اور اس کا ضمیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ جو روپیہ کسی جائز یا ناجائز طریقہ پر کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی خوش حالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اس لیے کہ یہ سب مسلمان ہیں اور ایک مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر ذلت اور احکامِ مذہب کی صریح مخالفت کے بعد ہی ہو قومی خوش حالی کے مرادف ہے۔

اس ذہنیت و سیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیرکٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا، بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ عام بے اصولی، تناقض اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں (الا ماشاء اللہ) ہر قسم کا خلاف تہذیب اشتہار شائع کرایا جاسکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کردی جائے۔ ادبی رسائل میں ہر قسم کے مخرب اخلاق،

حیا سوز و عریاں مضمون، افسانے، اشعار شائع ہو سکتے ہیں، بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لیے وہ آلہ بن سکتے ہیں، بدتر سے بدتر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے اگر ان کو اس راستہ سے اپنے رسالہ کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فی صدی بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہرگز پروانہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلق خدا کی اخلاقی ابتری اور انحطاط کا ۹۹ فی صدی امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات درسائل کے مالک وایڈیٹر ذاتی طور پر شریف مسلمان ہوں، اور وہ خود ان چیزوں کو اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن اگر آپ اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہدیں گے کہ تجارت وصحافت میں اصول، مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔

اخبارات کسی اصول اور صحیح مسلک کی ترجمانی اور صحیح خیالات وافکار کی اشاعت کے بجائے اپنے قارئین اور عوام کے خیالات وخواہشات کی ترجمانی کو اصولِ صحافت سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کی ناراضی اور بددلی کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی خوشی اور اپنے اخبارات کی مقبولیت و اشاعت کے لیے ہر قسم کی بے اصولی، ہر طرح کے تناقض اور ہر درجہ کے ابتذال کو گوارا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذاق سلیم، فکر صحیح اور اخلاقِ قومی پر یہ اخبارات بڑی طاقت کے ساتھ اثر انداز ہیں اور مسلمانوں کے افکار وخیالات میں جو عام بے ربطی وتناقض، عام ذہنی انتشار اور اشتعال پذیری پائی جاتی ہے اس میں میرے نزدیک ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔

مسلمان اہل علم اور اہل قلم کو آپ ہر کام پر لگا سکتے ہیں اگر اس کا خاطر خواہ معاوضہ آپ ان کو ادا کریں۔ ان سے خود ان کے خیالات وافکار کے خلاف سب کچھ کہلوا سکتے ہیں، لکھوا سکتے ہیں اور شائع کروا سکتے ہیں اگر اس کی قیمت ادا کر سکیں۔ بڑے بڑے سنجیدہ اور ذی علم اہل قلم واخبار نویس اور پُرجوش اسلامی نظمیں لکھنے والے شاعروں سے ایسے پروپیگنڈے کا کام لیا جا سکتا ہے جس سے وہ خود بھی متفق نہیں ہیں۔ اگر آپ اُن سے اس بارہ میں استفسار کریں گے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ "اس میں کونسا مذہبی

یا قومی نقصان یا شرعی گناہ ہے ؟ یہ تو ایک "بزنس" ہے۔ ایک شخص ہم کو معاوضہ دیتا ہے اور ہم اس کے بدلے میں اُسے ایک تقریر یا مضمون تیار کر دیتے ہیں۔ گویا ضمیر فروشی بھی ایک شریفانہ تجارت ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور زیادتی پر مدد کرنا) خود کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ دماغی و ذہنی بیسوائی اُس بیسوا عورت کے گناہ سے بدتر ہے جو اپنا جسم کرایہ پر چلاتی ہے۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی قومیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی ترقی اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سربلندی اور شخصی منفعت کے لیے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً اب اُن کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا تناسب قائم رہے خواہ وہ آبکاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا، سودی کاروبار کے نظام ہوں یا فی سبیل الشیطان لڑنے والے نظام۔ غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جس کی حرمت مسلمانوں کے لیے قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے اور جس پر قرآن کی یہ دو آیتیں شاہد ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (النساء)

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا (النساء)

اس کو اسی قومی مفاد اور مسلمانوں کے تناسب اور ان کے قومی تفوق کو برقرار رکھنے کے لیے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول و صداقت پر مفاد و مصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں وقیع نہیں۔

اصل چیز وہ منافع اور فوائد ہیں جن کا حصول اپنی ذات، خاندان، یا قوم کے لیے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کے لیے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصول کی حامل و امین ہے اور اصول و اخلاق، سیرت و کردار میں تمام دنیا کے لیے نمونہ و شاہد ہے (وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے اگرچہ ایک خالص "قوم" کے لیے بالکل مناسب اور عین مطابق ہے، اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟

یہ ذہنیت و سیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندوستان میں اس پچیس تیس برس کے عرصہ میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دفاعی جذبہ نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے اصول و اخلاق پر بڑے بڑے مصالح و منافع کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لیے انھوں نے عظیم الشان سیاسی و معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کے معاملہ میں ٹھیک یہی طرز عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطۂ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہیے۔ صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور ایک دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی خاطر ان کو جبلہ جیسے باثر والیٔ ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دستبردار ہونا پڑا مگر انھوں نے اس کے لیے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبلہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرماں روا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، غسان سے ہزار درجہ بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ادنیٰ درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیار سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لیے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو ان کو اپنی خلافت میں پیش آئیں

مگر نظام خلافت میں انھوں نے کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک ایسے نظام حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندوستان میں مقبول نہیں ہوتے تھے ہندوستانی مسلمانوں کا کیرکٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے با اصول اور وضعدار شرفا بھی جھوٹ بولنا، اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے اور مر جانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ بدایوں کے ایک بزرگ (غالباً مولوی رضی الدین صاحب) ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ماخوذ تھے۔ کلکٹر یا جج ان کا شاگرد تھا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ مولوی صاحب ایک مرتبہ اپنی زبان سے جرم کا انکار کر دیں تو وہ ان کو صاف بری کر دے گا۔ لیکن انھوں نے آخر وقت تک جھوٹ بولنے اور اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کیا اور سزائے موت قبول کی۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ہندوستان کی مشہور تحریکِ جہاد (حضرت سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک) میں کچھ اختلاف کیا، بعد میں انگریزوں نے نو گاؤں صلہ میں دینے چاہے مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا اجتہاد تھا میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

یہ سینکڑوں ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں۔ شریف خاندانوں اور شرفا کی بستیوں میں جا کر پوچھیے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ سنیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاق کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اس زمانہ کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فروشیوں اور مسلک و خیالات کی نیرنگیوں سے کیجیے، تو آپ کو اس عام قومی انحطاط اور اخلاقی زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آ رہا ہے اور روز بروز سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان کا

دل خون ہوتا ہے اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے لیے اور پڑھنے والوں کے لیے کوئی خوش گوار چیز نہیں۔

اخلاق و سیرت اس امت کے نظامِ جسم میں قلب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ تنومند و فربہ جسم کو دیکھ کر اس جسم کی صحت و طاقت کا حکم لگا دیتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ قلب کس قدر کمزور اور ماؤف ہے اور کس طرح بتدریج اس کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد، ان کے قومی جوش، ظاہری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے تناسب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک بااصول، دنیا کے لیے ایک پیغام رکھنے والی، اور اخلاق و سیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لیے معیار بننے والی امت کی پیمائش کا ہرگز یہ صحیح پیمانہ نہیں۔ ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق و اوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں، اور جن سے اس امت کا تشخص و امتیاز ہے وہ روبانحطاط ہیں یا روبترقی۔ اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے اقوال و افعال سے ہو سکتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم:

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

(باقی)

جبر و قدر

(ایک تقریر جو ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

کیا ہماری تقدیر پہلے سے مقرر ہے؟ کیا ہماری کامیابی اور ناکامی، ہمارا گرنا اور اُبھرنا، ہمارا بگڑنا اور سدھرنا، ہماری راحت اور تکلیف اور وہ سب کچھ جو ہمارے ساتھ اس دنیا میں پیش آتا ہے کسی اور طاقت یا طاقتوں کے فیصلہ کا نتیجہ ہے جس کے متعین کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم بالکل مجبور ہیں؟ کیا ہم اس دنیا میں محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں جنھیں کوئی اور نچا رہا ہے؟ کیا ہم کسی بنی بنائی سکیم کو عمل میں لانے کے لیے بس ایک آلہ کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں گویا کہ ہم دنیا کے اسٹیج پر اُن ایکٹروں کی طرح ہیں جن میں سے ہر ایک کا کام پہلے سے کسی نے مقرر کر دیا ہو؟

یہ سوالات ہمیشہ سے ہر اس شخص کے دل میں کھٹکتے رہے ہیں جس نے کبھی دنیا اور انسان کے متعلق کچھ غور کیا ہے۔ فلسفی، سائنسداں، مورخ، مقنن، سماج اور اخلاق اور مذہب کے مسائل سے بحث کرنے والے، اور عام لوگ، سبھی کو اس گتھی سے اپنا دماغ لڑانا پڑا ہے کیونکہ ہر ایک کی گاڑی یہاں آ کر اٹک جاتی ہے اور آگے نہیں چلتی جب تک کہ اس کا کوئی نہ کوئی قابلِ اطمینان حل نہ مل جائے، چاہے وہ بجائے خود صحیح حل ہو یا غلط۔

محض ایک سادہ سی "ہاں" یا "نہیں" میں آپ ان سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دے لیجیے، ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کا دل مطمئن ہو جائے، مگر خواہ آپ "ہاں" کہیں یا "نہیں"، دونوں صورتوں میں بے شمار دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا جواب دینا آپ کی ہاں اور نہیں دونوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

آپ "ہاں" کہتے ہیں تو پھر ساتھ ہی آپ کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ پتھر، لوہے، درخت، جانور اور انسان میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ سب کی طرح انسان بھی وہی کچھ کر رہا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اختیا

نہ اُن کو حاصل ہے نہ اِس کو۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا اور انسان کا ریلوے لائن تیار کرنا، دونوں میں چاہے درجہ کا فرق ہو مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں کیونکہ اُس سے چھتہ اور اِس سے ریلوے لائن کوئی اور ہی بنوا رہا ہے۔ ایجاد کے شرف سے دونوں محروم ہیں۔ اس کے بعد آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ایک آدمی کا نیک کام کرنا اور ایک موٹر کا درست چلنا، دونوں یکساں ہیں۔ کسی آدمی کا جرم یا شرارت کرنا اور کسی سینے والی مشین کا خراب بخیہ کرنا دونوں کی ایک حیثیت ہے۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو جس طرح آپ "نیک موٹر" "شریر مشین" "ایماندار انجن" "بدمعاش چرخہ" نہیں بولتے اسی طرح آپ کو آدمی کے لیے بھی نیک و بد، شریر اور شریف، ایماندار اور بے ایمان، اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ نہیں بولنے چاہییں۔ یا اگر آپ بولتے ہی ہیں (کیونکہ جو کچھ آپ سے بلوایا جا رہا ہے وہ بولنے پر آپ مجبور ہیں) تو کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ یہ الفاظ ہیں بے معنی۔ پھر بات اسی پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا مذہب اور اخلاق، یہ ہمارا قانون اور عدالتوں کا نظام، یہ ہماری پولیس اور جیل اور تفتیش جرائم کے محکمے، یہ ہمارے مدرسے اور تربیت گاہیں اور اصلاحی ادارے، سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ کام یہ سب ہوتے رہیں گے، بند ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا، کیونکہ آپ کے نظریہ کے مطابق ان سب ایکٹروں کو دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا مقررہ پارٹ ادا کرنا ہی ہے، مگر ظاہر ہے کہ جب مسجدوں کے نمازی اور مندروں کے پجاری، عدالتوں کے جج اور چوری اور ڈکیتی کے مجرم سب کے سب محض ایکٹر بن کر رہ جائیں اور عبادت گاہوں سے لے کر جوئے خانوں اور قید خانوں تک سب کے سب ایک بڑے ناٹک کے مختلف منظر قرار پائیں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی پوری مذہبی و اخلاقی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا ہے۔ وہ شخص جو رات کی تنہائی میں نہایت خلوص سے پوجا اور عبادت کر رہا ہے، اور وہ جو کسی کے گھر میں نقب لگا رہا ہے، دونوں اس تماشے میں بس وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ان کے درمیان کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ ڈائرکٹر نے ایک کو عابد و زاہد کا پارٹ دیا ہے اور دوسرے کو چور کا۔ ہماری عدالت میں جج صاحب خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ مقدمہ کی سماعت فرما رہے ہوں اور اپنی دانست میں مقدمہ کو سمجھ کر انصاف کرنے کی

کیسی ہی کوشش کر رہے ہوں، مگر آپ کے اس نظریہ کی رو سے وہ اور مستغیث اور ملزم سب بڑے ایکٹر ہیں اور بیچارے اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ کر رہے ہیں ڈراما اور سمجھ رہے ہیں کہ عدالت کے کمرے میں واقعی عدالت ہو رہی ہے۔ یہ انجام ہے اُس "ہاں" کا جو آپ نے شاید سرسری طور پر میرے ابتدائی سوالات کے جواب میں کر دی تھی۔

اچھا، تو کیا پھر آپ ان سوالات کا جواب "نہیں" کی صورت میں دیں گے؟ مگر مشکل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی معاملہ ایک "نہیں" پر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ اس کے ساتھ آپ کو بہت سی صریح حقیقتوں کا انکار کرنا ہو گا۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر پہلے سے مقرر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی تقدیر کسی بیرونی قوت کے فیصلہ سے نہیں بنتی تو غالباً آپ کے اس انکار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ مقرر کرتا ہے یعنی اس کی تقدیر اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اِس پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اس بیان میں لفظ "انسان" سے کیا مراد ہے؟ فرداً فرداً ایک ایک آدمی؟ یا انسانوں کا ایک بڑا گروہ جیسے سماج یا سوسائٹی یا قوم کہا جاتا ہے؟ یا پوری نوعِ انسانی؟ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے تو ذرا اُن چیزوں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے جن سے تقدیر بنتی ہے، پھر فرمائیے کہ آدمی اُن میں سے کس کس پر قابو رکھتا ہے۔ تقدیر بنانے کا پہلا سامان آدمی کے اعضا اور اس کی ذہنی اور جسمانی قوتیں اور اس کے اخلاقی اوصاف ہیں جن کی درستی اور خرابی، توازن اور عدمِ توازن، کمی اور بیشی کا فیصلہ کن اثر اس کی تقدیر پر پڑتا ہے۔ مگر یہ ساری چیزیں ہر انسان ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے اور آج تک کوئی ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جو خود اپنی تجویز اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے آپ کو بنا کر لایا ہو۔ پھر آدمی کی تقدیر کے بننے اور بگڑنے میں اُن بہت سے اثرات کا دخل بھی ہوتا ہے جو انسان کو وراثت میں اپنے آباواجداد سے ملتے ہیں۔ پھر جس خاندان، جس سوسائٹی، جس طبقے، جس قوم اور جس ملک میں وہ پیدا ہوتا ہے اس کی ذہنی، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات کے بے شمار اثرات دنیا میں قدم رکھتے ہی اُس پر چھا جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں

آدمی کی تقدیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں، مگر کیا کوئی شخص ایسا ہے جس نے اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے اس نسل اور اس ماحول کا تعین کیا ہو جس میں اُسے پیدا ہونا ہے اور خود یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ ان میں سے کس کس کے کیا اثرات قبول کرے؟ اسی طرح آدمی کی تقدیر پر دنیا کے بہت سے واقعات اور اتفاقات کے بھی اچھے اور بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ زلزلے، سیلاب، قحط، موسم، بیماریاں، لڑائیاں، معاشی اتار چڑھاؤ اور اتفاقی حادثے اکثر انسان کی پوری زندگی کا رُخ بدل دیتے ہیں اور اس کے ان سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس نے بڑے سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے اپنی راحت اور اپنی کامیابی کے لیے بنائے ہوتے ہیں۔ اور اس کے برعکس بارہا یہی اتفاقات اچانک ایک انسان کو ایسی کامیابیوں تک پہنچا دیتے ہیں جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ یہ ایسی نمایاں حقیقتیں ہیں جن سے انکار کرنے کے لیے بڑی ہٹ دھرمی کی ضرورت ہے۔ پھر آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے؟

اب اگر آپ اپنے دعوے میں ترمیم کرکے یہ کہتے ہیں کہ افراد نہیں بلکہ قومیں اپنی تقدیر بناتی ہیں تو یہ بھی ماننے کے قابل بات نہیں۔ ہر قوم کی تقدیر جن اسباب سے بنتی ہے اُن میں نسلی خصوصیات، تاریخی اثرات، جغرافی حالات، قدرتی وسائل اور بین الاقوامی صورتِ حال کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات دنیا کی کسی قوم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ پھر وہ قانونِ قدرت جس کے تحت زمین و آسمان کا انتظام ہو رہا ہے اور جس میں دخل دینا تو درکنار اُسے پوری طرح جان لینا بھی کسی قوم کے بس کا کام نہیں ہے، اِس طرح قوموں کی تقدیر پر اثر ڈالتا ہے کہ اس کو روکنے یا اس سے بچنے کی طاقت کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ قانون پس پردہ اپنا کام کرتا رہتا ہے اور کبھی اچانک اور کبھی بتدریج اس کے عمل سے ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں جو اُبھرتی ہوئی قوموں کو گراتے اور گرتی ہوئی قوموں کو اُبھا دیتے ہیں۔ خیر یہ تو وہ اسباب ہیں جو صریح طور پر انسانی دست رس سے باہر ہیں۔ مگر جو اسباب بظاہر انسان کی دست رس میں ہیں اُن کا تفصیلی جائزہ بھی کچھ بہت امید افزا نہیں ہے۔ ایک قوم کی تقدیر بننے کا بہت کچھ انحصار

اس پر ہے کہ اسے مناسب رہنمائی (لیڈرشپ) میسر آئے اور اس کے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد میں وہ صفات اور وہ خصوصیات موجود ہوں جو اس رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہیں۔ مگر تاریخ سے ہم کو ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی، اور نہ اپنے زمانہ کے مشاہدات میں ہم ایسی کوئی نظیر پاتے ہیں کہ کسی قوم نے ان دونوں چیزوں کے حاصل کرنے میں آزادی کے ساتھ خود اپنے ارادے اور انتخاب سے کام لیا ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب ایک قوم کے ابھرنے کا وقت آتا ہے تو اس کو اچھی رہنمائی بھی میسر آجاتی ہے اور اس میں وہ خصوصیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس رہنمائی کی کامیابی کے لیے مطلوب ہیں، اور وہی قوم جب گرنے لگتی ہے تو رہنمائی اور پیروی دونوں کی قابلیتیں اس سے اس طرح رخصت ہو جاتی ہیں کہ اس کا کوئی دردمند بھی خواہ انہیں واپس نہیں لاسکتا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کونسا قانون ہے جس کے تحت تاریخ اقوام کے یہ نشیب و فراز واقع ہوتے ہیں۔

پھر کیا قوموں کو چھوڑ کر آپ پوری نوع انسانی کے متعلق یہ حکم لگائیں گے کہ وہ اپنی تقدیر آپ بناتی ہے؟ مگر یہ کہنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ نسلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی، ملکوں میں پھیلی ہوئی، بے شمار مختلف تمدنوں اور تہذیبوں میں رنگی ہوئی، اور لاتعداد زبانیں بولنے والی نوع کے متعلق اگر کوئی شخص یہ فرض کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک مجموعی ارادہ ہے جس کے مطابق وہ سوچ سمجھ کر اپنی تقدیر معین کرتی ہے، تو حقیقت میں وہ ایک بڑی عجیب بات فرض کرتا ہے۔ کیا واقعی اس نوع نے اپنی رفتار ترقی کے لیے یہ ٹائم ٹیبل خود تجویز کیا تھا کہ فلاں دور تک یہ پتھر کے اوزاروں سے کام لے گی، پھر لوہے اور آگ کو استعمال کرنا شروع کردے گی؟ فلاں عہد تک انسانی اور حیوانی طاقت سے کام کرتی رہے گی، پھر مشین کی طاقت استعمال کرنے لگے گی؟ فلاں صدی تک کمپاس کے بغیر کشتیاں چلائے گی پھر اپنی سمت سفر معین کرنے میں کمپاس سے کام لے گی؟ پھر کیا وہ نوع انسانی ہی ہے جس نے افریقہ، امریکہ، یورپ، ایشیا، اور آسٹریلیا کی مختلف قوموں یعنی خود اپنے مختلف حصوں کے لیے مختلف تقدیریں معین کی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسے عجیب و غریب دعوے

کرنے کا خیال بھی کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ کے لیے اپنی اس رائے پر قائم رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ کیونکہ جب نہ ہر ہر فرد اپنی تقدیر کا مالک ہے، نہ افراد کا کوئی مجموعہ، نہ پوری نوع، تو یہ تقدیر کی ملکیت آخر کس "انسان" کے حصہ میں آئے گی؟

آپ نے دیکھا، وہ سوالات جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے، ان کا جواب نہ محض "ہاں" کی صورت میں دیا جا سکتا ہے اور نہ محض "نہیں" کی صورت میں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ جو زبردست ارادہ کائنات کے اس زبردست نظام کو چلا رہا ہے اس سے آزاد ہو کر کوئی چیز دنیا میں کام نہیں کر سکتی، بلکہ کام کرنا تو کیا معنی جی بھی نہیں سکتی۔ ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جو پوری قوت کے ساتھ زمین و آسمان میں چل رہی ہے۔ کسی میں اتنا بل بوتہ نہیں ہے کہ اس اسکیم کے خلاف چل سکے یا اس کو بدل سکے یا اس پر کوئی اثر ڈال سکے۔ ہمارے جتنے علوم، جتنے تجربات، جتنے مشاہدات ہیں سب کے سب اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ کائنات کی اس سلطنت میں کسی کی خود مختاری کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آسمان کے بڑے بڑے کُرّوں کو جس نظام کی بندش اپنے مقرر کردہ راستے سے بال برابر جنبش نہیں کرنے دیتی، زمین کو جس طاقت نے ایک ضابطہ کے مطابق گردش کرنے پر مجبور کر رکھا ہے، ہوا اور پانی اور روشنی اور گرمی و سردی پر جس حکومت کا مکمل اقتدار ہے، انسان کی پیدائش سے پہلے جس قوت نے وہ اسباب فراہم کیے جن سے اس زمین پر انسان کا موجود ہونا ممکن ہوا اور جس قوت کے اختیارات کا یہ حال ہے کہ اسبابِ زندگی کے توازن میں تھوڑا سا ردّ و بدل بھی کر دے تو ہماری پوری نوع آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر سکتی ہے، اس کے ماتحت رہتے ہوئے انسان کے لیے ایسی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ طاقت جو ہمیں اس دنیا میں لائی ہے جس نے ہم کو علم، غور و فکر، ارادہ اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں جس نے ہم میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ ہم کچھ اختیار رکھتے ہیں جس نے ہم میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ ہم نیک و بد میں امتیاز

کرتے ہیں۔ اخلاقی اور غیر اخلاقی افعال میں فرق کرتے ہیں اور دنیا کے معاملات میں ایک طرزِ عمل اختیار کرتے اور دوسرا طرزِ عمل ترک کرتے ہیں۔ اس سے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ محض مذاق کے طور پر کیا ہے۔ ہمیں اس کائنات کی تدبیر و انتظام میں انتہا درجہ کی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ مذاق اور کھیل اور تمسخر کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا حقیقت وہی ہے جو وجدانی طور پر ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے، یعنی فی الواقع ہم کو یہاں ایک محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہم مناسب حد تک آزاد بھی رکھے گئے ہیں یہ آزادی حاصل کی ہوئی نہیں ہے بلکہ دی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کتنی ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے، اس کا تعین مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ آزادی ہے ضرور۔ کائنات کی عالمگیر اسکیم میں ہمارے لیے یہی جگہ تجویز کی گئی ہے کہ ہم ایک محدود پیمانہ پر آزادانہ کام کرنے والے ایکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ ہمارے لیے یہاں اتنی ہی آزادی ہے جتنی آزادی کی اس اسکیم میں گنجائش ہے۔ اور ہم اخلاقی حیثیت سے درحقیقت اسی قدر ذمہ دار ہیں جس قدر ہم کو آزادی بخشی گئی ہے۔ یہ دونوں امور کہ ہم کس قدر آزاد ہیں اور ہم پر اپنے افعال کی ذمہ داری کتنی ہے، ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہیں۔ ان کو وہی طاقت جان سکتی ہے جس نے اپنی اسکیم میں ہمارے لیے یہ مقام تجویز کیا ہے۔

یہ نظریہ ہے جو اس مسئلہ میں مذہب نے اختیار کیا ہے۔ مذہب ایک طرف قادرِ مطلق خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اور ہمارے گردوپیش کی ساری دنیا خدا کی محکوم ہے اور اس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری طرف وہ ہم کو اخلاق کے تصورات دیتا ہے، نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم ایک راستہ اختیار کریں گے تو ہمیں نجات حاصل ہوگی اور دوسرے راستہ پر چلیں گے تو ہم کو سزا دی جائے گی۔ یہ بات صرف اسی صورت میں معقول ہو سکتی ہے کہ ہم واقعی اپنے اختیار سے اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

دین ایک جامع اصطلاح یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات میں استعمال کرتا ہے جن میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا، لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ (۷) لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے، لیکن ابھی اس کو "دین" کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔

حسب ذیل آیات میں "دین" اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (توبہ - ۴)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے)، نہ یوم آخر (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں، نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں "دین حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح واضع اصطلاح جل شانہ نے پہلے تین فقروں میں خود ہی کر دی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسٰى وَ

فرعون نے کہا چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل ہی کیے دیتا ہوں

لِيَدْعُ رَبَّهُ إِنِّي أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ (المومن ۔ ۳)

اور اب پکارے وہ اپنے رب کو، مجھے خوف ہے کہ وہ کہیں تمہارا دین نہ بدل دے یا زمین میں فساد نہ کھڑا کر دے۔

قرآن میں قصہ فرعون و موسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد "مذہب" کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ "اسٹیٹ" کا ہم معنی ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظام زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین و رسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اکھڑ جائے گا اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہو گا یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا بلکہ تمام ملک میں بدنظمی پھیل جائے گی۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران ۔ ۲)

اللہ کے نزدیک دین تو دراصل "اسلام" ہی ہے۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۔ ۹)

اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (التوبہ ۔ ۵)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (الانفال ۔ ۵)

اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (النصر)

جب اللہ کی نصرت آ گئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرو اور اس سے درگذر کی درخواست

کرو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

ان سب آیات میں دین سے پورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے۔ پہلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح نظامِ زندگی صرف وہ ہے جو خدا ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار کی اطاعت پر ہو مالکِ کائنات کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہے اور فطرۃً نہیں ہو سکتا اس لیے کہ انسان جس کا مخلوق، مملوک اور پروردہ ہے اور جس کے ملک میں رعیت کی حیثیت سے رہتا ہے وہ تو کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان خود اس کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گزارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا حق رکھتا ہے۔ تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اسی صحیح و برحق نظامِ زندگی یعنی اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو تمام دوسرے نظاموں پر غالب کر کے رہے۔ چوتھی آیت میں دینِ اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک کہ فتنہ، یعنی اُن نظامات کا وجود دنیا سے مٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔ پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس موقع پر خطاب کیا گیا ہے جب کہ ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی، اسلام اپنی پوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدنی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آکر اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور کیا گیا تھا، تو آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا نقص سے پاک، بے عیب ذات اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے، لہٰذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اس کی تسبیح اور حمد و ثنا کرو اور اس سے درخواست کرو کہ مالک! اس ۲۳ سال کے زمانۂ خدمت میں اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں جو خامیاں اور جو کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں انھیں معاف فرما دے۔

مطبوعات

آئینۂ مصحف | از آغائے کہت۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ علیہ بکڈپو بھنڈی بازار بمبئی۔ قیمت ۸ر

کتاب شعر میں ہے اور زبان فارسی۔ مصنف انجمن اسلام بمبئی میں مشرقی زبانوں اور تاریخ اسلام کے استاد ہیں۔ زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں "حسن جاوید" اور "رموز عشق"۔ دونوں حصے تمام تر رباعیات پر مشتمل ہیں "حسن جاوید" کا موضوع قرآن ہے۔ اس میں قرآن کی تعریف و توصیف اور حقائق قرآنی کو مسلمانوں کی بے اعتنائی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ دوسرے حصے میں رموز عشق کے علاوہ دیگر متفرق مضامین بھی ہیں۔

ملت ابراہیم | از جناب عرشی امرتسری۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ دفتر امت مسلمہ، امرتسر، پنجاب۔ قیمت ۵ر۔

امرتسر کی "امت مسلمہ" کا مسلک اب معروف عام ہو چکا ہے۔ طالب حق لوگ ہیں مگر علم اور توازن ذہنی کی کمی کے سبب سے افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ عرشی صاحب اسی "امت" کے ایک فرد ہیں اور انھوں نے کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ملت ابراہیم کیا تھی۔ سارے قرآن میں سے "ملت ابراہیمؑ کو تحقیق و اتباع کے لیے چن لینے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ابراہیمؑ ہی آخری نبی کے مُطاع اور صحف ابراہیمؑ ہی قرآن کا ماخذ ہیں (حالانکہ آخری نبیؐ اور ابراہیمؑ میں مطیع اور مطاع کا اور قرآن اور صحف ابراہیمؑ میں ماخذ و ماخوذ کا تعلق نہیں۔ بلکہ تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ آخری نبیؐ اور ابراہیمؑ دونوں ایک مطاع کے مطیع ہیں اور قرآن اور صحف ابراہیم دونوں ایک ماخذ سے ماخوذ ہیں)۔ دراصل اُن کے اِس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کے مفصل احکام قرآن میں مذکور نہیں ہیں اس لیے وہ ملت ابراہیمؑ کی تحقیق کے سلسلہ میں ایک "مختصر اور قابل عمل" دین تلاش کرنا چاہتے ہیں جس میں شریعت کی بندشیں نہ ہوں۔ انھوں نے صلوٰۃ ابراہیمؑ، زکوٰۃ ابراہیمؑ، حج ابراہیمؑ، روزۂ ابراہیمؑ کی ایک خود ساختہ نوعیت متعین کی ہے اور انتہائی بے باکی سے لکھا ہے کہ "ابراہیمؑ کی نماز جہت و قبلہ کی قید سے

آزاد تھی، اُن کی زکوٰۃ فقیہانہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہ تھی مان کا حج بھاگنا دوڑنا اور جگہ جگہ جانور کاٹ پھینکنا نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔" مقصد یہ ہے کہ بس "نماز" پڑھی جائے بغیر اس کے کہ اس کی صورت متعین ہو، روزہ رکھا جائے بغیر اس کے کہ اس کا کوئی ضابطہ ہو، حج کیا جائے بغیر اس کے کہ اس کے کچھ قواعد مقرر ہوں۔ یہ سب تفقہ اور بصیرت کے بغیر قرآن پڑھنے کے نتائج ہیں اور ایسے لوگوں کے حق میں ہماری دعا بس یہ ہے کہ اللہ نے جب اُن کو اپنی کتاب پڑھنے کی توفیق بخشی ہے تو اس کے ساتھ انھیں کتاب کی سمجھ بھی عطا فرمائے۔

معلمِ قرآن | از مظہر احمد صاحب دہلی تھانوی۔ ضخامت ۱۱۰ صفحات۔ ہدیہ ۸/ علاوہ محصول ڈاک۔

یہ قرآن کے تیسویں پارے کا ترجمہ ہے ہر سورت کو لے کر شروع میں شانِ نزول لکھی ہے، اس کے بعد سورۃ کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف کے ترتیب وار الگ الگ معانی لکھے ہیں، اس کے بعد سورۃ کو عنوانات میں تقسیم کر کے ہر عنوان کے نیچے سورۃ کا ایک ٹکڑا مع ترجمہ لکھا ہے۔ جا بجا مختصر تفسیری نوٹ بھی ہیں۔ عربی سے ناواقف یا بتدی کے لیے جو سورت کو سمجھنا چاہے یہ ترجمہ مفید ہوگا۔

فلاحِ دین و دُنیا | تالیف ماسٹر شیخ محمد عظیم ایلچپوری۔ ضخامت ۲۰ صفحات۔ قیمت ۸/۔ ملنے کا پتہ شیخ رحیم ولد شیخ محمود جنرل بک ڈپو، ایلچپور، برار۔

مؤلف کا مقصد مسلمان قوم کی دینی و دنیوی اصلاح ہے۔ کتاب کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو اسلام کے احکام کا پابند ہونے اور اسوۂ رسول پر چلنے کو لکھا گیا ہے۔ دوسرے باب میں مسلمانوں کی تنظیم کے لیے عملی تجویزیں پیش کی ہیں۔ اس سلسلہ میں معاشی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اسلام کے اقتصادی نظام کو قائم کرنے کی ترغیب دی ہے صنعت و تجارت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اصلاحِ رسوم پر زور دیا ہے۔

گلدستۂ نماز | از فضل الرحمٰن صاحب کلیم۔ ملنے کا پتہ شیخ فضل الرحمٰن کلیم، حافظ آباد، ضلع گوجرانوالہ۔

اس میں نماز کے ارکان میں سے ایک ایک کو لے کر پہلے اس کے الفاظ اور پھر پوری عبارت کے لفظی اور

بامحاورہ معنی لکھے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ مطالب کی بھی تشریح کردی گئی ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے۔ اگر بچوں کو نماز باترجمہ پڑھانے کی ضرورت ہو تو گلدستہ نماز اس ضرورت کو پورا کرے گا۔

حقیقت الصوم | از مولانا تمنا عمادی۔ قیمت ۱؎ ملنے کا پتہ منیجر مکتبہ اسلامیہ دارالادب۔ پھلواری شریف (پٹنہ)

اس میں مولف نے بتایا ہے کہ روزے کی حقیقت اور اس کا مقصد کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ جس روزے سے متوقع مقصد حاصل نہ ہو وہ روزہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔

محمدؐ رسول اللہ | مترجمہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب عاقل رحمانی۔ کتابستان، پوسٹ بکس نمبر ۶۴۲۱، بمبئی نمبر ۳۔ قیمت ۸؍

یہ انگلستان کے مشہور مفکر طامس کارلائل کے مجموعہ خطبات "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں سے ایک خطبے کا ترجمہ ہے۔ انبیاء کی فہرست میں سے کارلائل نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہیرو منتخب کیا ہے اور انہی کو اپنے ایک مستقل خطبے کا موضوع بنایا ہے۔ کارلائل ایک صاف دل اور بے تعصب انسان تھا۔ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے مطالعہ سے جو تاثرات اس کے دل و دماغ نے اخذ کیے ہیں ان کا اظہار بلا کم و کاست اس نے اپنے خطبے میں کردیا ہے۔ اس کی سنجیدہ اور متین زبان اور اس کا پُرزور اور بلیغ اندازِ بیان اس موضوع کے لیے خوب موزوں تھا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی خصوصیات کسی طرح برقرار نہیں رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کارلائل کے تشبیہات و استعارات سے بھرے ہوئے مضامین کو اردو کا قالب پہنانا بہت مشکل ہے تاہم موجودہ ترجمہ سے بہتر ترجمہ ممکن تھا۔ اس میں تو اکثر جگہ مطلب ہی خبط ہوگیا ہے اور اکثر جملے لفظی ترجمہ ہونے کی وجہ سے بھونڈے ہو کر رہ گئے ہیں مثلاً "گناہ جزئیات اور پوست ہوں بالکل آسان اور معمولی چیزیں ہیں"۔ "وہ مردہ خشک ریت کی طرح بالکل صاف ہے"۔ "کعبہ دنیا کی عجیب شان والوں میں سے ایک عجیب شان والی چیز ہے"۔ ایک ایک صفحہ غیر مانوس ترکیبوں اور الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً فاش وحشت، ابدیت مجہولہ، ملامت ذاکرہ، ناقابل نظر،

بر تربیت، صنعتِ تحریر، انتشارِ حق حتیٰ کہ زبان کی غلطیاں بھی موجود ہیں مثلاً صاف و شفاف رات کا سحر، جھوٹے اصطلاحات، دہشت اور شک کے ساتھ توجہ کیا۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ مغربی مصنفین کا اللہ، نبی، وحی، اور کتاب کا تصور ہمارے تصور سے بالکل مختلف ہے اس لیے ایک مسلمان مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اسلام سے متعلق ان کی ہر تصنیف کا ترجمہ کرتے وقت اِس بنیادی اختلاف کو واضح کر دے تاکہ پڑھنے والا ان کی غلطیوں پر متنبہ ہو جائے۔

شانِ خدا

تالیف مولانا عبدالرحمٰن صاحب عاقل رحمانی۔ ضخامت ۷۴ صفحات، کتابستان، قیمت ایک روپیہ۔

کتاب کا موضوع وجودِ باری ہے۔ تالیف میں کسی منطقی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے چند یونانی اور یورپین فلاسفہ کے اقوال اثباتِ وجودِ خالق کے بارے میں درج کیے ہیں۔ اس کے بعد چند ملحدین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ پھر ایک باب مادہ اور روح سے متعلق ہے۔ اس کے بعد "قرآن اور وجودِ خالق" کے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ وجودِ خالق کے ثبوت میں قرآن کا طرزِ استدلال کیا ہے۔ یہ ساری بحث کا اہم ترین پہلو تھا، اسے پوری طرح واضح اور مکمل ہونا چاہیے تھا اور قرآنی طرزِ استدلال کی نوعیت اور حکمار و فلاسفہ کے طرزِ استدلال سے اس کے بنیادی فرق کو پوری طرح واضح کر دینا چاہیے تھا۔ اِس کے بعد ایک باب تصورِ توحید سے متعلق ہے۔ اِس میں دیگر مذاہب سے مقابلہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ توحید اسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ ساتھ ہی توحید کے لیے چند دلائل پیش کیے ہیں۔ سب سے آخری باب اسمار و صفات سے متعلق ہے۔ اِس میں اللہ کے ننانوے (۹۹) ناموں کو مختلف عنوانات کے ماتحت جمع کیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن میں اُن کے ذکر کا مقصد کیا ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب دیا ہے۔ یہ تمام تدابیر اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

[illegible]